ڈاکٹر علی شریعتی

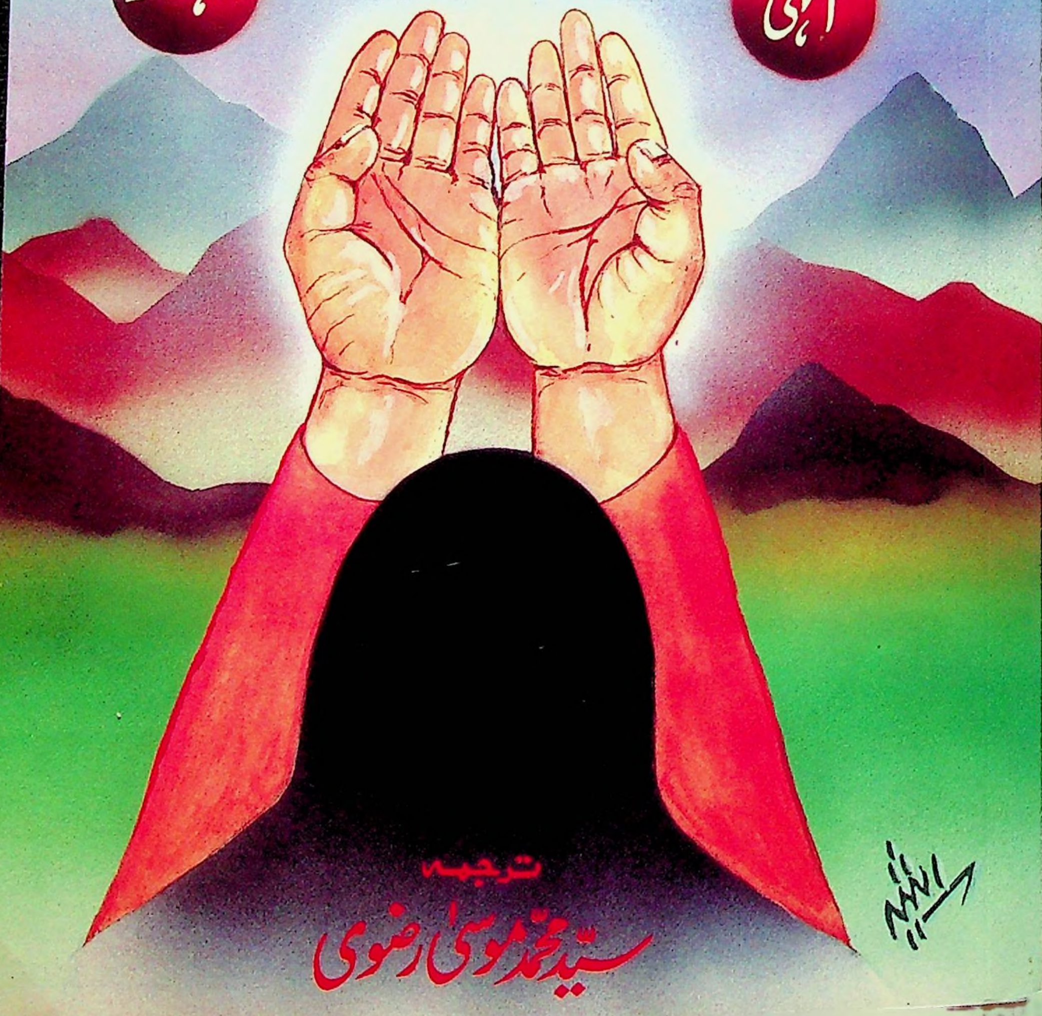
امام سجادؑ کی درسگاہِ دعا میں

عشق

حاجت اور

آگہی

جہاد



ترجمہ
سید محمد موسیٰ رضوی

ڈاکٹر علی شریعتی

امام سجّادؑ کی درسگاہِ دُعا

میں

آگہی ــــ عِشق ــــ حاجت اور جہاد

ترجمہ

سیّد محمّد موسیٰ رضوی

★★★★★

نام کتاب : امام سجادؑ کی درسگاہ دعا میں

آگہی۔ عشق۔ حاجت اور۔۔ جہاد

مصنف : ڈاکٹر علی شریعتی

اردو ترجمہ : سید محمد موسیٰ رضوی

پروف ریڈنگ : سید آل حسن رضوی

سنہ اشاعت : 1997 عیسوی

ناشر : ادارہ "ن والقلم"

اے۔ 87- بلاک 5- گلشن اقبال

فون : 4966068

کمپوزنگ : Vis Computers

فون : 4967759

*

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

ساری تعریف اس بے نیاز کے لئے کہ جس نے نیازمندوں کو "ادعونی استجب لکم" کی ترغیب دے کر ان میں عبادت و اطاعت کا جذبہ پیدا کیا اور کہا: "اجیب دعوۃ الداع اذا دعان" میں دعا کرنے والے کی دعا کو سنتا ہوں۔ جب وہ دعا کرے اور یہ بھی کہا کہ "فذکرونی اذکرکم" "تم ہمیں یاد رکھو، ہم تمہیں یاد رکھیں گے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے "ادعوا ربکم تضرعا" وخفیتہ"" کہہ کر ہمیں دعا کا طریقہ بھی بتایا کہ "تم اپنے پروردگار کو تضرع اور عاجزی کے ساتھ چپکے چپکے پکارو۔"

اور درود و سلام ہو محمدؐ اور ان کی آل سلام اللہ علیھم پر کہ جنہوں نے خدا سے رابطے میں الفاظ کے وہ موتی بکھیرے کہ جو اس کی پیشگاہ عظمت و جلال کے شایان شان تھے۔ جن کی زبان سے اتنی چیزیں یکجا ہیں جن کو اکابر حکماء، یکتائے روزگار فلاسفہ اور شہرہ آفاق فطین علماء کی زبانیں ملا کر بھی یکجا نہیں کیا جا سکتا۔

اور زندہ جاوید رہے وہ ذات کہ جس نے محمدؐ اور آل محمدؐ کے نورانی عقلوں سے اپنی فکر کی آبیاری کی اور پھر انہی کے نقش قدم پر، ان کے زبان کی زیبائی اور تجمل کلام کے ساتھ بڑی بے باکی سے آگے بڑھتا رہا اور اس راہ میں اس نے نہ جانے کتنے دکھ اور کتنی مصیبتیں

جھیلیں اور یہ دکھ اسے اپنوں نے بھی دیئے اور غیروں نے بھی۔ یہاں تک کہ خدا سے متوجہ ہو کر اسے کہنا پڑا:

"خداوندا تیرا شکر کرتے میری زبان نہیں تھکتی کہ جس قدر میں تیری راہ میں، تیرے پیام کی راہ میں زیادہ آگے بڑھتا ہوں، زیادہ مشقت جھیلتا ہوں، ان لوگوں کو جنہیں چاہئے کہ میرا ساتھ دیں، میری راہ میں کانٹے بکھیرتے ہیں۔ جنہیں چاہئے کہ حق شناسی کریں حق تلفی کرتے ہیں۔ جنہیں چاہئے کہ شفقت سے ہاتھ ملائیں، سیلی مارتے ہیں، جنہیں چاہئے کہ دشمن کی نسبت میرا دفاع کریں دشمن سے پہلے حملہ کرتے ہیں۔ جنہیں چاہئے کہ غیروں کی زہر افشانی کے مقابل میری ستائش کریں، مجھے تقویت پہنچائیں، میری ہمت بندھائیں، مجھے تسلی دیں، مجھے ملامت کرتے ہیں، کمزور بناتے ہیں، ناامید کرتے ہیں، اور مجھ پر الزام لگاتے ہیں تاکہ میں

---تیری راہ میں--- اس واحد
سہارے سے جس سے میں نے آس باندھ
رکھی ہے ناامید ہو جاؤں' اپنی آنکھیں بند
کرلوں اور راندہ درگاہ ہو جاؤں......
خدایا میری مدد فرما تاکہ میری واحد امید تو
رہے......."

یقیناً" خدا اس کی راہ میں سچائی کے ساتھ کام کرنے والوں کو مایوس نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج سارے عالم میں ہر نقطہ نظر سے وابستہ دانشور طبقہ اس کی کتابوں کا متلاشی ہے اور مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے بڑی تیزی سے شائع ہو رہے ہیں۔ امریکہ میں اس کی کتابوں کے انگریزی ترجمہ کا کام شکاگو میں مقیم ایک انتہائی لائق اور دیدہ ور خاتون لالہ بختیار (Laleh Bakhtiar) صاحبہ نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے اور اس مشکل کام کو اپنی مشقت اور مہارت سے پڑھنے والوں کے لئے آسان بنا دیا ہے۔ ہم ان کو اور ان کی محنتوں کو سلام کرتے ہیں۔

اب ڈاکٹر علی شریعتی کے پڑھنے والے شائقین کی خدمت میں کتاب ھذا کے مختصر تعارف کے لئے عرض ہے کہ یہ کتاب دراصل ڈاکٹر علی شریعتی کی اس تقریر کا قالب ہے جسے انہوں نے جید علماء

اور بلند پایہ دانشوروں کی اس کانفرنس میں خطاب کیا تھا جو "دعا" کے موضوع پر ایران میں منعقد ہوئی تھی۔

اس میں اس نے دعا سے متعلق اپنے اہم ترین نظریات کو پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے' دعا صرف موجودہ زندگی کی ضرورتوں کا چاہنا نہیں ہے بلکہ بلندپایہ دعا زندگی سے بالاتر ضرورتوں کا چاہنا ہے اور ایک تشنہ و دلدادہ روح کے لئے دعا' ابدیت کی سمت معراج ہے' اس چوٹی کی سمت پرواز ہے جو ابدیت سے ملی ہوئی ہے اور اس مرکز کی سمت بلند ہونا ہے جو ہر شے سے ماورا ہے۔

علی شریعتی نے سطحی طور پر اسلامی دعاؤں کا مطالعہ کرنے کے بعد ان تین عناصر پر گفتگو کی ہے جو اسلامی دعاؤں کی تشکیل کرتے ہیں' ان میں سے ایک زبان کی فصاحت و بلاغت۔ دوسرے' جملوں کے الفاظ اور متن میں کلام کی موسیقیت' اور تیسرا ان کا فکری عنصر ہے۔ وہ اسلامی دعاؤں میں "صحیفہ سجادیہ" کو پیش کرکے کہتا ہے کہ ساری اسلامی دعاؤں کا متن شروع سے آخر تک خدا شناسی' انسان شناسی' اخلاقی اصول' معاشرتی اصول' لوگوں کے ایک دوسرے پر حقوق' بشری آئیڈیلز کی گفتگو اور اسی طرح سماجی' انفرادی اور اخلاقی پستیوں اور خطروں سے خوف و گریز کی گفتگو پر مشتمل ہے۔

اس نے بتایا کہ: صحیفہ سجادیہ تنہائی میں جہاد اور چھائی ہوئی

خاموشی میں ابلاغ اور عرض مدعا کی کتاب ہے، شکست میں مورچہ سنبھالنا ہے، گھٹن میں فریاد کی آواز بلند کرنا ہے، سلے ہوئے ہونٹوں سے سبق دینا ہے، غیر مسلح کئے جانے والے کا اسلحہ سنبھالنا ہے...... اور ان سب باتوں کے باوجود "دعا کی کتاب" ہے۔

خداوند عالم سے دعا ہے کہ وہ اس سرتاپا مظہر عشق و آگہی کو عبادت گزاروں کی اس زیبا ترین روح سے ہمکنار کرے کہ جو اخلاص، ایثار، محبت، کرامت، شرافت، فروتنی، باریک بینی، نیکی اور وجدان کی لطافت میں اعلیٰ ترین درجوں پر فائز ہے اور جس کے لئے "جامعہ مصریہ" کے پروفیسر استاد محمد کامل حسین نے کہ جو کتاب "الادب فی مصر الاسلامیہ" اور "مروان بن ابی حفصہ" کے مصنف ہیں کہا کہ: کیا تمہارا خیال ہے کہ فرزدق نے اپنے شعروں میں امام زین العابدینؑ کی تعریف کا حق ادا کردیا جس میں اس نے کہا:

"یہ وہ ہیں جن کے پیروں کی چاپ کو
سرزمین مکہ پہچانے ہوئے ہے اور اس
کے حل و حرم، سب اس سے واقف
ہیں۔ یہ اس ہستی کے فرزند ہیں جو خلق
خدا میں سب سے بہتر تھی۔ یہ متقی، پرہیزگار،
پاک وپاکیزہ اور مشہور روزگار ہستی ہیں۔"

ہرگز نہیں۔ بخدا فرزدق اپنے ان شعروں کے اندر ان کی توصیف میں ایک شمہ بھی نظم نہیں کرسکا ہے......

اور جنکے صحیفے کے مطالعہ نے مصر کے بلند پایہ علمی حلقوں میں ایک دھوم مچادی ہے اور جسے پڑھ کر مصر کے شہرت یافتہ استاد فیلسوف طنطاوی جوھری کو خدا کی بارگاہ میں شکوہ کرنا پڑا کہ:

"اے خدا یہ تیری کتاب قرآن مجید ہے اور یہ اہلبیت میں سے ایک بزرگ ہستی کے ارشادات ہیں۔ یہ دونوں کلام۔ وہ آسمان سے نازل شدہ کلام، اور یہ اہلبیت کے صدیقین میں سے ایک صدیق کی زبان سے نکلا ہوا کلام، دونوں بالکل متفق ہیں۔ اب میں ہندوستان اور تمام اسلامی ممالک میں بلند آواز میں پکار کر کہتا ہوں: اے فرزندان اسلام، اے اہل سنت، اے اہل تشیع کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ تم قرآن اور اہلبیتؑ کے مواعظ سے سبق حاصل کرو۔ یہ

دونوں تم کو ان علوم کے حاصل کرنے کی
طرف بلا رہے ہیں جن سے عجائب قدرت
منکشف ہوتے ہیں اور خدا کی معرفت
حاصل ہوتی ہے۔"

خداوند عالم ہمیں بھی ان علوم کو حاصل کرنے' انکی ہدایات پر عمل کرنے اور ان سے مستفید ہونے کی توفیق عنایت فرمائے۔

حلقہ بگوش خاندان نبویؐ
سید محمد موسیٰ رضوی

دعا

میں گفتگو سے گریز کررہا تھا، اور اس کے دو اسباب تھے۔ پہلا سبب یہ کہ عام طور پر ہمارے مذہبی رجحان رکھنے والے لوگوں کی نگاہ میں ---البتہ مستثنیٰ لوگوں کے استثنا کے ساتھ-- اور اسی طرح لوگوں کی اس صنف کی نظر میں بھی کہ جو تعلیم یافتہ یا بقول معروف ترقی پسند ہیں'---یعنی وہ لوگ بھی کہ جو بیشتر دعا سے متوسل ہوتے ہیں اور وہ بھی کہ جو دعا پر حملہ آور ہوتے ہیں--- دونوں دعا کو ایک نشہ آور اور مسکن دوا سمجھتے ہیں۔ اپنی کمزوریوں کی تلافی، ذمہ داریوں سے گریز، بیکاری، کاہلی، خطرات سے بھاگنے، سماجی ذمہ داریوں کا بوجھ سہنے کی طاقت اور زندگی کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہ رکھنے اور ان ساری کمزوریوں کے عنوان سے دعا، ان تمام انسانی خصوصیات کی ایک جانشین ہوگئی ہے۔ یعنی عام طور پر ہماری سوچ یہ ہے کہ بجائے' سوچنے، کوشش کرنے، جہاد کرنے، جنگ کو برداشت کرنے، سختیوں اور مشقتوں کو جھیلنے اور انفرادی اور اجتماعی زندگی کی ذمہ داری قبول کرنے کے 'دعا سے رشتہ جوڑا جاسکتا ہے۔ اس بناء پر رائجہ مفہوم میں دعا اس بات سے عبارت ہے کہ دعا کرنے والا اپنی سستی، کاہلی اور کمزوریوں کے سبب خدا سے ان چیزوں کو طلب کرے جنہیں وہ اپنی کوششوں اپنے دوڑ دھوپ اور مشقتوں سے حاصل کرسکتا ہے۔

دعا کے اس طرح کے اکتساب نے اس کے بارے میں گفتگو کو میرے لئے بہت مشکل کردیا' اس لئے کہ مجبوراً" مجھے بہت زیادہ وقت چاہئے تاکہ پہلے میں اسلامی معاشرے میں اس طرح کے فکر کے رونما ہونے کی کیفیت اور دعا کی نسبت اس طرح کے اکتساب سے پردہ اٹھاؤں اور بتاؤں کہ کس طرح اسلام سے قبل کی دعاؤں اور غیراسلامی ذرائع سے یہ مفہوم آج کے اسلامی نظریہ میں جاگزیں ہوئی اور اسی طرح' کیونکہ کمزوریاں' ناکامیاں' ناامیدیاں اور اسلامی تاریخ کے ناپسندیدہ واقعات موجودہ کیفیت کی نسبت مسلمانوں کی تمکین کا باعث بنے اور عوام الناس چونکہ اپنے اہداف کو حاصل کرنے سے مایوس ہوئے اور انہوں نے اپنے منتہائے آرزو کے استقرار اور کمال مطلوب کے حصول میں اپنے آپ کو عاجز اور کمزور پایا اس لئے خواہ ناخواہ انہوں نے دعا سے اس طرح کے نتیجے اور اکتساب کی طرف رغبت اختیار کی اور اس بات کے معتقد ہوئے کہ دعا' انسان کے ارادے کی کمزوری اور ذمہ داری سے اس کے گریز کا ازالہ کرسکتی ہے اور اس چیز کو حاصل کرنے کے لئے کہ جسے کام کاج' محنت' مشقت' صبر' ایمان' تفکر اور برداشت و استقامت کی راہ سے حاصل کیا جانا چاہئے' دعا سے توسل کو اس میں راہ دی۔

مجھے اگر فرصت میسر ہوئی تو میں اس بات کو واضح کروں گا کہ دعا

انسانی کمزوری کی تلافی نہیں کرتی بلکہ وہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کو سنوارنے میں انسان کی تعمیری اور مثبت کوششوں کو جاری رکھنے اور انہیں تقویت پہنچانے میں مدد دیتی ہے۔ یعنی دعا، کام اور فرائض کی انجام دہی کی ہمردیف نہیں ہے۔ بلکہ اسلامی دعا کا وجود فرض کی ادائیگی اور محنت، مشقت، اور صبر و جہاد کے عمل کو جاری رکھنے کے ساتھ ہے۔ وہ لوگ کہ جنہوں نے تاریخ اسلام میں دعا کے بنیادی متون کو ہمارے لئے رکھ چھوڑا ہے خود اس نقل کا ایک نمونہ اور اس اصل کی ایک نمایاں مثال ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جو دشمن سے جنگ کے لئے، سعادت کے حصول کے لئے قوت، طاقت اور استقلال و آزادی کو اپنانے کے لئے اور معاشرتی اور اعتقادی برائیوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے، مسلح تھے، بیدار رہتے تھے، ثابت قدم تھے، آپ خود جنگ کی ہولناکیوں میں کود پڑتے تھے اور یہی دعا بھی کرتے تھے! یہ وہ لوگ نہیں تھے کہ جنہوں نے گوشہ نشینی اختیار کی، رہبانیت کو اپنایا، پہاڑوں پر فرار اختیار کیا، معاشرے سے گریز اور بیزاری برتی اور کسی دیر، کسی خانقاہ اور کسی غار میں پناہ لی اور دعا سے رشتہ جوڑا۔

علیؑ تھے کہ جنہوں نے دعا کا حق ادا کیا اور کس طرح کیا؟ پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تھے کہ جنہوں نے دعا کی اور کس طرح

کی؟ جنگ کے تمام مقدمات کو، عمومی بیداری کو، ساری طاقتوں کی یکجائی کو، اور اسی طرح صف آرائی کو، اسی طرح جنگ کی معمولی سے معمولی ٹیکنیکی اور اسٹریجی نکتوں کو ملحوظ خاطر رکھا، صف آرائی کی، جنگ کے مادی، معنوی اور منطقی قوت پر تکیہ کیا، دشمن کے مقابل آئے، جنگ کے تمام اصلی اور فرعی اصول و قواعد کی رعایت کی اور پھر ان تمام منطقی، علمی، سماجی، سیاسی، فوجی اور اقتصادی مقدمات سے فارغ ہونے کے بعد دعا کی اور یہ دعا بھی ایسی نہیں ہوتی تھی کہ بارالہا اگر ہم نے بددیانتی کی، اگر فرض میں کوتاہی کی، اگر تلوار کے خوف سے فرار اختیار کیا، اگر دشمن کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے، اگر دشمن نے ہم سے زیادہ استعداد کا مظاہرہ کیا، اگر ہم میں دشمن پر فوقیت کی صلاحیت نہیں تھی تو، تو اپنے کرم سے ہم کو ان پر کامیابی عنایت فرما، تو اپنے الٰہی اعجاز سے ان کو کمزور کردے، ملیامیٹ کردے، نابود کردے.......!

یہ علیؑ ہیں کہ جو دشمن کے مقابل آکر جنگ کے معمولی سے معمولی نفسیاتی، معنوی، فکری اور فوجی نکتوں کو خاطر میں لاتے ہیں اور پھر ارشاد فرماتے ہیں :

"پہاڑ اپنی جگہ چھوڑ دیں مگر تم اپنی جگہ سے نہ ہٹنا، لشکر کی آخری صفوں پر اپنی نگاہ رکھنا۔ (ان مناظر پر

توجہ نہ دینا کہ ہر بار کوئی کسی اسلحہ پر ہاتھ دھر رہا ہے' فلاں جگہ کوئی تاک میں بیٹھا ہے' ابھی کہیں سے کوئی تیر آنے والا ہے اور تم ان باتوں سے اپنی روحانی قوت اور مقادمت و استقامت کی طاقت کھودو' دور دشمن کی آخری صف پر نگاہ رکھو۔) پہاڑ ٹل جائیں اور تم نہ ٹلو' دشمن کے فوج کی آخری صف تمہاری نگاہوں کی زد پر ہو' اپنے دانتوں کو بھینچ لو' اپنے قدم زمین میں گاڑ دو اپنا سر اللہ کے حوالے کردو اور پھر لڑو اور یقین رکھو کہ مدد خدا ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔" (۱)

ان سب امور کے بعد آپ نے دعا کی اور وہ بھی کیسی دعا :

"خداوندا اگر ہمیں ان پر کامیابی ہوئی تو' تو ہمیں غرور' خودغرضی' استبداد' خودسری' اور اس ظلم و ستم سے محفوظ فرما کہ جو فاتح قوموں کا وتیرہ ہے اور اگر ہم نے ان سے شکست کھائی تو' تو ہمیں ذلت و بردگی سے اپنی امان میں رکھ!"

۱- یہ جملے حضرت علی علیہ السلام نے اپنے بیٹے محمد حنفیہ کو جنگ جمل میں علم دیتے وقت کہے۔

یہ دعا کی زبان تھی اور یہ وہ زبان تھے جو دعا کرتے تھے۔

وہ لوگ کہ جو سیاسی رہبری، سماجی ذمہ داری، انفرادی زندگی کی کفالت اور دوسروں کی تقدیر کے عہدہ دار تھے اور ان کی ساری زندگی، سماجی ذمہ داری کے لئے وقف تھی وہ اپنے مثبت سماجی امور کی انجام دہی کے بعد اس طرح دعا کرتے تھے۔ ایک نشہ آور، مسکن دوا اور شجاعت و مردانگی اور حساسیت و آگاہی و بیداری کو مارنہار کے طور پر نہیں، (جیسا کہ ہم سب سمجھتے ہیں)

دوسری مشکل یہ ہے کہ بیرون ملک جانے سے پہلے جب میں ایران میں تھا تو اتفاق سے مجھے فرانس کے بلند پایہ عالم وفیلسوف "الکسس کارل" کے طرز تفکر سے کم وبیش آشنائی ہوگئی تھی اور مجھے اس کے بارے میں مزید معلومات کا بڑا اشتیاق تھا، اسی لئے جب میں یورپ پہنچا تو میری سب سے پہلی کوشش یہ رہی کہ میں اس کی علمی اور فکری کاموں پر مبنی دعا (La Priere) نامی کتاب کو حاصل کروں اور بالاخر میں نے اسے ڈھونڈ نکالا۔ الکسس کارل وہ شخص ہے کہ جس نے دو نوبل پرائز حاصل کئے۔ اس نے ان دونوں انعامات کو کسی فلسفی، ادبی، تاریخی اور یہاں تک کہ علوم انسانی کے موضوعات میں حاصل نہیں کئے بلکہ بہت نازک علوم سے اس کا رشتہ رہا۔ پہلا نوبل پرائز اسے رگوں کی پیوند کاری اور ٹانکوں کے اس انداز کے بارے

میں ملا جسے اس نے پہلی بار صورت دی۔ دوسرا نوبل پرائز اسے اس بات پر ملا کہ اس نے ایک چوزے کے دل کو اس کے بدن سے جدا اپنے تجربہ گاہ میں 35 سال زندہ رکھا۔ اس مدت میں کچھ کچھ عرصے بعد یہ دل اپنی اصلی حالت سے کئی گنا بڑھ جاتا تھا جسے مجبورا" پھر چھوٹا کرنا پڑتا تھا۔ یہاں تک کہ تجربہ گاہ میں اس کی نگہداشت مشکل ہوگئی۔ لیکن بدن سے باہر ایک زندہ عضو کو ۳۵ سال تک باقی رکھنے میں کامیابی نے اسے نوبل پرائز کا حقدار بنایا۔ اس بناء پر الکسس کارل ایک فزیالوجسٹ ہے' ایک جراح ہے' ایک ماہر علم الاعضاء ہے۔ وہ نہ کوئی پادری ہے' نہ فلسفی اور نہ ماہر نفسیات کہ جو دینی یا منطقی' فلسفی' کلامی یا پھر نفسیاتی اعتبار سے دعا پر توجہ دے۔ وہ ایک طبیب ہے کہ جس نے مختلف مریضوں کے ساتھ اپنے رابطے کے پورے عرصے میں کہ جس میں پادری' جراح' سیاستمدار' ایڈووکیٹ' مزدور' دھقان' عام کاروباری آدمی اور سبھی نسل اور سبھی قسم کے لوگ شامل ہیں۔ دعا کے اثرات کو انسانی اور روحانی اعتبار سے اور شروع میں فقط جسمانی اعتبار سے مطالعہ کیا۔ ایک ماہر علم حیاتیات اور فزیالوجسٹ کی حیثیت سے اور اسی طرح بعد میں "راکفیلر" نامی علم الانسان (Ethnology) کے ادارے کے سربراہ کے عنوان سے اس کے برسوں کا مطالعہ اس بات کا سبب بنا کہ وہ اپنی تحقیقات کو

دعا کے نام سے ایک مختصر کتابچے کی صورت میں تشکیل دے' اور بعد میں "لارڈ" (Contemplation Sur Lourdes) کی زیارت کی نسبت میرے تاثرات کے نام سے اسی عنوان پر میں نے بھی اس سے زیادہ مختصر ایک رسالہ تحریر کیا۔

دعا کی نسبت الکسس کارل کے نظریات بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس لئے کہ جیسا کہ ہم نے کہا کہ ایسے فلسفی' ایسے اہل قلم' اور ایسے مذہبی مفکر بہت سے گزرے ہیں کہ جنہوں نے دعا کی منزلت اور اس کی تاثیر کا گہری نظروں سے جائزہ لیا ہے لیکن یہ بات زیادہ قابل قدر ہے کہ ایک بافت شناس اور ماہر علم حیاتیات صرف اور صرف تشخیص مرض' فزیالوجی اور کلینیکلی جائزوں کی راہ سے' وہ بھی اپنی ذاتی لیبورٹریل (Laboratorial) تجربات سے دعا کو کنسیڈر کرے' یہ ایک اہم بات ہے۔ خاص کر اس انسان کی نسبت سے کہ جسے آج کی دنیا علمی تفکر کے اعتبار سے ایک ممتاز محور کا درجہ دیتی ہے۔ وہ اس کتاب میں دعا سے متعلق ایسی باتوں کا ذکر کرتا ہے' اور ایسے نتائج سامنے لاتا ہے کہ جسے پڑھ کر ہم جیسے دعا کی تاثیر کے معتقد لوگ بھی حیران و ششدر رہ جاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے جب کسی قوم میں رسم دعا کمزور پڑجاتی ہے اور لوگ اسے بھلانے لگتے ہیں تو یہ بات قوم و ملت کے انحطاط اور استحکام ناپذیری کا سرآغاز ہوتی ہے۔ اس بناء

پر معاشرہ دعا اور پرستش کے عمل کو کھو کر' انحطاطی جراثیم کی بالیدگی' زوال' انتشار' اور اس کی اپنی خاص اصطلاح میں "انٹروپی" یعنی مزاجی طاقتوں کی کمزوری اور ضعیف بدنی کو کہ جو اس منزل میں سماجی مزاج کے ضعف سے عبارت ہے' اپنے لئے آمادہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے :

> "روم۔ اس پر شکوہ و پر عظمت قدیم متمدن روم کو' عبادت میں قدیم طریقہ بشری سے وہاں کے لوگوں کی دوری نے کمزور اور رسوا کیا۔"

اس کی تعبیرات' بعض اوقات بہت خوبصورت' عمیق' اور شاعرانہ ہوتی ہیں اور بعض اوقات بہت پیچیدہ' عمیق' عالمانہ اور فلسفیانہ رنگ لئے ہوتی ہیں۔ وہ کہتا ہے :

> "دعا ایک امانت کی طرح اس کے ساتھ ہوتی ہے جو کثرت سے بارگاہ الٰہی میں دست بدعا ہوتا ہے۔ خدا کی عبادت اور دعا کے نور کی تجلیاں' دعا کرنے والے کے چہرے' نگاہ اور افعال سے مدام ساطع ہوتی ہیں اور وہ اسے جہاں جاتا ہے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔"

جرائم کی فہرست بہ طور متوسط بتاتی ہے کہ جو لوگ معاشرے میں

مجرم اور ملزم کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں وہ لوگ ہیں کہ جو یا سرے سے دعا نہیں کرتے یا بہت کم اور جاہلانہ انداز میں اس سے رشتہ جوڑتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس اسی معاشرے اور اسی معاشی طبقے میں وہ لوگ کہ جنہوں نے ابھی تک دعا کی رسم یا دعا کی سنت کو قائم رکھا ہے ارتکاب جرم سے بچے ہوئے ہیں اور اگر کبھی ان سے کوئی جرم سرزد ہو جاتا ہے تو وہ ازروئے عادت اور ازروئے مشغلہ نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ جرم ان کی معین صفات میں شمار ہوتا ہے بلکہ اس کا شمار ان کی زندگی کی لغزشوں اور حادثوں میں ہوتا ہے۔

ہر سال "لارڈ" کا ادارہ (الکسس کارل کی "دعا" کی کتاب کے حوالے سے) ان شفا پانے والے مریضوں کی فہرست کو کہ جن کو دعا سے معجزاتی طور پر صحت ملی ہے ڈاکٹروں کی تصدیق کے ساتھ شائع کرتا ہے۔ ہمیشہ دعا کے ذریعے معجزاتی طور پر شفا پانے والے مریضوں کا کالم فراواں ارقام سے مملو ہے، لیکن "کارل" اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ حالیہ ۳۰ سالوں کے درمیان لوگوں کی اس تعداد میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ اس کے بعد وہ خود اس کی وضاحت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کا سبب یہ ہے کہ "زائر حضرات اب زیادہ تر سیاح ہو گئے ہیں اور زوار مسافر" اور ان لوگوں میں کمی واقع ہو گئی ہے کہ جو شیفتہ و فریفتہ اور عاشق و آرزومند بن کر آتے تھے تاکہ اپنی مراد حاصل

کریں۔ یہ لوگ تفریح اور معلومات کی غرض سے دل میں شک و تردید کا میل لئے آب و ہوا کی تبدیلی کے ضمن آتے ہیں اور ناچار' دعا کا کوئی اثر ان پر مرتب نہیں ہوتا۔

"کارل" یہاں دعا کی تاثیر کے میکانزم میں پھر ایک نظریہ سامنے لاتا ہے اور کہتا ہے "دعا کے لئے ضروری ہے کہ وہ شدت' تعین وقت' استمرار اور خلوص کی حامل ہو اور اسی طرح اس میں جارحیت کی حالت پیدا ہو۔"

جارحیت کی یہ حالت بڑی بھلی اور موزوں ہے۔ اسلامی دعاؤں اور متون میں بھی کثرت سے یہ بات آئی ہے کہ :

"اس طرح اور اس شدت سے دعا مانگو جس شدت سے کہ بچہ اپنی ماں سے کسی چیز کا مطالبہ کرتا ہے۔"

بالکل یہی بات کارل بھی کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے :

"دعا کے لئے ضروری ہے کہ وہ شدت کے ساتھ ہو"

یعنی دعا زبان کی حرکت و اضطراب کی بے معنی آواز یا بے معنی ورد کی صورت میں نہ ہو کہ زبان اور ہونٹ اپنا عمل جاری رکھیں اور

دل و دماغ دوسرے امور میں مصروف ہوں اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو کہ جو نعوذ باللہ خدا کو ٹوپی پہناتے ہیں اور وہ اس طرح ہے کہ مجلس وعظ و مصیبت میں شرکت کرکے، شرکت کا ثواب حاصل کرتے ہیں اور اسی حال میں بجائے مجلس سننے کے دعا یا قرآن پڑھنا شروع کردیتے ہیں اور اس طرح قرآن یا دعا کا ثواب بھی حاصل کرتے ہیں یعنی دگنا اور دو آتشہ ثواب حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ ہوشیار لوگ ان ہی دو حالتوں کے ساتھ جن میں ان کے کان منبر کی طرف اور آنکھیں قرآن پر ہوتی ہیں، اپنے ہونٹوں کو اور کسی وردو ذکر پر لگادیتے ہیں۔ یعنی وہ سہ آتشہ ثواب اکٹھا کرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ یہ دو تین چیزیں ایک دوسرے کو باطل کرتی ہیں!

اپنی تمام توانائی، تمام ادراک کی طاقت اور پوری قوت گرفت سے مانگو، یہ شدت و تواتر کا مفہوم ہے، یہ جانتے ہوئے کہ یہ جملے ہمارے لئے جانے پہچانے ہیں میرا ان پر تکیہ اس لئے ہے کہ کارل کی زبان سے ان کا سننا بڑی اہمیت کا حامل :

"وہ لوگ کہ جو صبح کو اٹھ کر دعا کرتے ہیں اور شام تک ایک جانور یا ایک وحشی کی طرح زندگی گزارتے ہیں دعا ان پر کسی طرح بھی اپنا اثر قائم نہیں کرتی۔"

ان کی دعائیں ابتر ہیں اس لئے کہ ان میں عالم کے روحانی مرکز کی طرف دل کے استمرار اور روح و وجدان کی پیوستگی کی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ مکمل میکانیکی انداز سے فرض کی ادائیگی کی صورت میں دعا کرنا اور سارے دن جانوروں کی طرح کھانے پینے' لڑنے جھگڑنے اور

ے

این مرآنزا ہمی کشد مخلب
و این مرآنزا ہمی زندمنقار

میں صرف کرنا اور دن بے ہودہ شور شرابے میں گزارنا' صبح تڑکے کی دعا کو بھلا دیتا ہے۔ لہٰذا جب کبھی دعا کا عمل جاری ہوتا ہے اور دل دنیا کے عظیم مرکز سے متصل ہوتا ہے تو دعا کرنے والے کو چاہئے کہ وہ اس اتصال کو ہر حالت اور روزانہ کی زندگی کے ہر رابطے میں اپنے معاشرے' اپنے خاندان اور اپنے اندر محفوظ کرے' تاکہ دعا کا اثر' دھیان کی صورت میں اس کے اندر موجزن ہو اور اس کے پورے وجود کا احاطہ کرے وگرنہ اس کی روح و ہستی کے لئے قرآن کی یہ گفتگو ملاحظہ کیجئے۔

"ارایت الذی یکذب بالدین ؟ فذلک الذی یدع
الیتیم ولا یحض علی طعام المسکین .. فویل
للمصلین' الذین ھم عن صلاتھم ساھون' الذین

ھم یراؤن ویمنعون الماعون."

(کیا تم نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو روز جزا کو جھٹلاتا ہے۔ یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور محتاجوں کو کھلانے کے لئے (لوگوں) کو آمادہ نہیں کرتا۔ تو ان نمازیوں کی تباہی ہے جو اپنی نماز سے غافل رہتے ہیں' جو دکھاوے کے لئے کرتے ہیں اور روزمرہ کی معمولی چیزیں بھی عاریتا" نہیں دیتے۔)

"دعا اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ انسان جو چاہتا ہے حاصل کرلیتا ہے اور جو دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اس پر کھل جاتا ہے' دعا کو چاہئے کہ وہ جارحیت لئے ہوئے ہو۔ جناب عیسیٰؑ کسی راستے سے گزر رہے تھے' راستے کے کنارے کوئی اندھا بیٹھا تھا جونہی اسے معلوم ہوا کہ عیسیٰؑ اس کے پاس سے گزر رہے ہیں اس نے بڑے غضب اور بڑی شدت سے انکا دامن پکڑ کر کھینچا اور انتہائی غصے اور جبرد سختی کے ساتھ ان سے اپنی بینائی چاہی اور ان کا دامن نہیں چھوڑا۔ یہاں تک کہ جناب عیسیٰؑ اپنا اعجاز دکھانے پر مجبور ہوئے اور کہا : "تیرے ایمان نے تجھے شفادی"

لیکن دعا باوجود اس کے کہ کسی چیز کو طلب کرنے اور کسی مطلوب کو حاصل کرنے سے عبارت ہے دوسری جہت میں ان باتوں سے کہیں زیادہ عمیق اور گہری ہے' یہی وہ منزل ہے کہ جہاں ہم اسلامی دعاؤں سے قریب ہوتے ہیں۔

عشق!

دعا صرف ہماری ضرورتوں کے حصول کا ذریعہ نہیں بلکہ خود عشق کی ایک تجلی بھی ہے۔ زیادہ تر وہ چیزیں جو منطق' تحلیلی جائزے' علم' اور فلسفیانہ اور عالمانہ تفکر سے ہاتھ نہیں آتیں' عشق سے' معشوق کی نسبت روح کی پیوستگی سے' اخلاص سے' اور اس کے غیر سے کٹ کر حاصل ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خداوند عالم' حیات و ہستی کے اس رمزاعلیٰ کو کہ جس سے وجود اور زندگی کے دو معجزے ظہور میں آئے ہیں ---(یہ بڑی خوبصورت تعبیر ہے' ہم اس مفہوم سے اچھی طرح واقف ہیں حکمت و عرفان میں اس کا تذکرہ ہے' لیکن یہ تعبیر کہ جس کا شمار انتہائی لطیف و عمیق عارفانہ تعبیر میں ہوتا ہے اس شخص کی زبان سے بے حد قابل توجہ ہے کہ جس کا تعلق صرف اور صرف تجربہ گاہ

فزیالوجی اور علم الاعضاء سے ہے اور تجربہ گاہ کی راہ سے اس طرح کے عمیق اور عرفانی احساس تک پہنچنا انتہائی دلچسپ بات ہے---)
خدا اس رمز اعلیٰ کو کہ جس سے حیات و وجود کے دو معجزے ظہور میں آئے ہیں اس پر ظاہر کرتا ہے کہ جو سوائے "چاہنے" کے اور کچھ نہیں جانتا اور یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح کہ وہ اپنے آپ کو اُس سے پوشیدہ رکھتا ہے جو سوائے "جاننے" کے اور کچھ نہیں جانتا!

وہ لوگ کہ جو صرف عقلی اور منطقی تفکر کو "شناخت" کی راہ گردانتے ہیں' وہ لوگ کہ جو رمز حیات' معنای ہستی اور روح کائنات کو اسی صورت میں تحلیل اور منطقی تجزیئے میں محصور کرنا چاہتے ہیں جس صورت میں کہ وہ اشیاء طبیعت اور قوانین طبیعیات و کیمیا کو تحلیل و تجزیہ کی منزل میں لاتے ہیں ایسے لوگ ہیں کہ جن کے لئے رمزِ وجود کا فہم بہت دشوار ہے۔ لیکن وہ لوگ کہ جو "چاہنے" اور عشق و ایثار و خلوص کا مفہوم جانتے ہیں' اور اچھی طرح جانتے ہیں خدا کو بخوبی سمجھتے ہیں' کس طرح؟ جتنی آسانی سے ہم کسی پھول کی خوشبو کو سونگھتے ہیں! خدا کے موجود ہونے کو محسوس کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ کوئی جگہ اس سے خالی نہیں۔

"چرچ خالی ہو چکا تھا' سب لوگ جا چکے تھے' باہمی
عبادت کے مراسم کا اختتام ہو چکا تھا' ساری

کرسیاں خالی تھیں۔ ہال کی کرسیوں کے آخری
صف میں ایک شخص بیٹھا ہوا تھا' جو نہ فلسفی تھا' نہ
طبیب' نہ حکیم تھا نہ فقیہ' بس ایک معمولی سیدھا
سادھا سا دیہاتی تھا! پادری اس کے پاس پہنچا اور
اس سے پوچھا : یہاں کیا کر رہے ہو؟ کہا :
"اسے دیکھ رہا ہوں اور وہ مجھے۔"

اتنی آسانی سے' وہ خدا کو جو گہرے فلسفیانہ افکار کے سامنے اپنے آپ کو پوشیدہ رکھتا ہے ایک سادہ سے احساس' ایک ریا سے پاک چاہت اور ایک بلند پایہ پاکیزہ عشق کے سامنے اپنے آپ کو کھل کر نمایاں کرتا ہے۔ دعا کرنا' عشق کرنے' احساس کرنے اور چاہنے سے متعلق ایک تجلی ہے۔ اس بناء پر یہ شناخت اور ادراک کے لئے ایک راہ ہے' اور ایمان لانے اور ایقان پیدا کرنے کا ایک راستہ ہے۔ لہٰذا کارل کی بنیاد پر دعا کی تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ دعا یا حمد و ثناء انسان کی روح سے متعلق تجلی عشق اور تجلی طلب ہے۔ عشق کیا ہے؟ اور طلب کیا ہے؟ ان جملوں کو جن کی تفصیل سے وضاحت کی ضرورت ہے اور جس کے لئے میرے پاس وقت نہیں میں نے صرف آپ کی توجہ کے لئے پیش کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس مجلس میں شرکت کرنے والوں کو اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ انسان

ان کامیابیوں کی میزان پر جو اسے زندگی میں حاصل ہوئی ہیں انسان نہیں ہے، بلکہ ٹھیک ان تمناؤں کی مقدار کے مطابق انسان ہے جسے وہ اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ ہر انسان کی بلندی اور کمال کے درجہ کو اس کی بلند و بالا تمناؤں اور کمی کی اس کھیپ کی میزان پر تولا جاسکتا ہے جسے وہ اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ یعنی ہر کوئی انسانیت کے درجہ میں اتنا ہی بلند ہے جتنی اس کی تمنائیں کامل تر، عظیم تر اور کمال سے قریب تر ہیں، کم درجے کے آدمی کی تمنائیں، کم درجے کی ہوتی ہیں اور بلند آدمیوں کی تمنائیں بلند۔ یہی وہ منزل ہے کہ جہاں : ؎

"آنان کہ غنی ترند محتاج ترند"

کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام کے مقام کی رفعت، اس بے نیازی میں نہیں ہے جو کسی اور میں نہیں تھی بلکہ ان بلند تر اور عظیم تر تمناؤں میں ہے جو دوسروں میں نہیں تھی، اور اسی طرح اس نیازمند تر ہونے اور عظیم تر تمناؤں میں ہے جو دوسروں میں نہیں تھی، اور اسی طرح اس نیازمند تر ہونے اور اپنے اندر زیادہ کمی کے احساس میں ہے جو دوسروں میں نہیں ہے۔

علم میں بھی یہی صورت ہے۔ ہر کوئی صرف اپنے معلومات کی میزان پر عالم نہیں ہے بلکہ ان مجہولات کی میزان پر عالم ہے جنہیں وہ

محسوس کرتا ہے جب میں آسمان کو دیکھتا ہوں تو میرے پاس مجہولات میں چند ایک سے زیادہ نہیں :

آسمان کیوں نیلا ہے؟ یہ ستارے اوپر کیا کر رہے ہیں؟ بادل اس طرح کیوں ہیں؟ لیکن وہ جو علمِ آسمان سے واقف ہے، آسمان میں ہزاروں مجہولات کو دیکھتا ہے۔

ایک ایسی عظیم روح کہ جو کائنات کی راہوں کو، اور اسی طرح انسان کے تکامل، استعداد اور امکانِ کمال کے کارواں اور اس کی روح کے عروج کو بہت دور کی منزلوں تک دیکھتی ہے اور کمال مطلق کی چوٹی کو وجود کے سربہ خدا کوہستانوں میں مشاہدہ یا محسوس کرتی ہے تو حیرت زدہ ہو جاتی ہے اور اسے احساس "ہراس" (خشیت) ہونے لگتا ہے۔ حیرت و ہراس خدا کے عظمت وجود اور ابدیت و زیبائی کے مقابل ہوتا ہے اور ان احساسات کو وہ دل پا سکتا ہے کہ جو ان کو سمجھنے اور محسوس کرنے کی استعداد رکھتا ہو اور اس کے ادراک کا دامن، دیوارِ ہستی کے آخری سرے تک پھیلا ہوا ہو۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آرزو کرتے ہیں کہ :

"پروردگار میری حیرت میں اضافہ فرما۔" یہ حیرت شناخت کی پیداوار ہے اور پریشانی، جہل کی، ہراس یا خشیت، عظمت و حیرت سے نمودار ہوتی ہے اور خوف یا بزدلی، گمراہی اور گناہ سے۔ یہ چار بالشتی گئے

ارواح کہ جن کے دل کی ظرفیت ایک انگوٹھی جتنی اور فکر رسا ناک کی نوک تک ہے بڑے خوش' بڑے مطمئن اور بڑے چین سے ہیں اور اپنے عقیق کی انگوٹھی' جو جتنی داڑھی' شاہ عبدالعظیم کی ایک زیارت' مختصر سے اطعام' چار پیسے صدقے اور مفتاح کے چند صفحوں کی قرات کے ساتھ اپنے آپ کو علم الیقین کا سمندر سمجھتے ہیں اور حورالعین! کی آغوش میں عالم و آدم' دنیا و آخرت اور حساب و کتاب سے اس طرح آسودہ خاطر ہیں جیسے انہیں پل صراط کا متولی بنادیا گیا ہو اور جنت کے ملائکہ ان کے اطرافیوں میں ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو "السماء و العالم" کی کتاب کا مطالعہ کر کے خلقت سے قیامت تک ساری فطرت اور سارے عالم کو اپنے کرتے کی جیب سمجھتے ہیں۔ "ناسخ التواریخ" کا مطالعہ کر کے کہ جس نے دوسری تمام تاریخوں کو نسخ کیا ہے' آدم سے خاتم تک ساری تاریخ بشریت کو پانی کا ایک گھونٹ جانتے ہیں' ان کے آگے مجہول نام کی کوئی شے نہیں۔ "منازل الاخرۃ" کا مطالعہ کر کے موت کے پہلے قدم سے قیام قیامت تک ساری آخرت کو عالم ظاہر کے جغرافیہ داں کی نسبت زیادہ بہتر انداز میں دیکھتے ہیں اور وہاں کے ایک ایک بالشت کا نقشہ ان کے پاس ہے اور بالاخر "مفاتیح الجنان" کی کتاب رکھ کر انہوں نے جنت کی تمام کنجیاں حاصل کرلی ہیں۔ اس سے زیادہ کسی کو اور کیا چاہیے؟

آپ دیکھ رہے ہیں کہ معمولی سی تمنا کا احساس، معمولی سے مجہول کا احتمال، شک کے کسی لحظہ کا تصور ان کے فکر و عمل میں، ان کی سرشت میں، اور ان کی ذات میں آپ کو نہیں ملتا۔ لیکن وہ حیرت انگیز انسان کہ "جس کا سینہ علم و آگہی سے مملو ہے" جس کی فکر زمین کی راہوں کی نسبت آسمان کی راہوں (یعنی محسوسات سے بالاتر ماورائے دنیا کے بلند پایہ مفاہیم یا عالی رتبہ احساسات اور عمیق خدائی عجائبات) سے آشنا تر ہے۔

جس کی فکر زمین کی راہوں کی نسبت (کہ جس میں روزمرہ کی زندگی، مصلحت اندیشی، اور معمولی ذاتی اور دنیاوی فائدے شامل ہیں) آسمان کی راہوں (یعنی محسوسات سے بالاتر، ماورائے دنیا کے بلند پایہ مفاہیم یا عالی رتبہ احساسات اور عمیق خدائی عجائبات) سے آشنا تر ہے۔ یہی وہ ہستی ہے کہ جو آدھی راتوں کو اپنا نرم بستر چھوڑ دیتی ہے، اس کا دم گھٹنے لگتا ہے اور وہ شہر سے باہر کے نخلستانوں میں نکل جاتی ہے اور نصف شب میں ملکوت، عظمت وجود و جمال، جاذبہ الٰہی، اور اپنی حقارت و نیاز کے آگے نالہ و فریاد بلند کرتی اور بے ہوش ہو جاتی ہے!

وہ زیادہ شدت سے عقب ماندگی کا احساس کرتی ہے اس لئے کہ وہ بیشتر، دور تر، اور بلند تر کو دیکھتی ہے۔ وہ ہستی بلندی و کمال کے جس

مرحلہ پر ہوتی ہے۔ اپنے آپ کو اس مطلق اور بلند و بالا چوٹی کی نسبت عقب ماندہ تر، نیازمند تر، مشتاق تر اور دل دادہ تر پاتی ہے۔ لیکن وہ شخص کہ جس کی فکر و نظر کی اڑان اپنے گھر کی چار دیواری یا محلہ سے آگے نہیں بڑھتی اسے اپنی عقب ماندگی اور پستی سے ہراس کا مطلق احساس نہیں ہوتا، کون ہے کہ جسے پستی سے وحشت اور زوال سے ہراس نہیں؟ یہ وہی شخص ہے کہ جو پہاڑ کی چوٹی کو دیکھ سکتا ہے لیکن وہ شخص کہ جو ارتقائی جست کو ایک یا دو میٹر سے زیادہ نہیں سمجھتا، توفیق کا سہارا لیتا ہے، بھرا پن دکھاتا ہے اور احساس غرور کرتا ہے، اس کی روح تشنہ اور اس کا دل نیازمند نہیں ہوتا۔

علی علیہ السلام جیسی عظیم، دردمند اور تشنہ و شیفتہ و آگاہ ہستی کو آپ، خوف، خشیت اور غش کے عالم میں صرف دعاؤں کی حد تک دیکھیں گے صرف دعا کی تنہائیوں میں یہ مافوق عقلی، علمی اور فلسفی انسانی تحلیل قابل توجیہہ ہے۔ وگرنہ وہ مسائل جو علیؑ پر مدینہ میں گزر رہے تھے اس کے لئے وہ عظیم روح بے چین نہیں تھی، اس کے خوف سے ان پر غشی طاری نہیں ہوئی۔ یہ عشق الٰہی سے سرشار عظیم اور بلند مرتبوں والی ہستی کہ جو نہ صرف مدینہ، عرب معاشرے، ساتویں اور آٹھویں صدی اور نہ صرف بشریت کو بلکہ وجود کو اپنے لامتناہی احساس کی ظرفیت میں محسوس کر رہی تھی۔ جس کی حیات کا دامن،

عالم ہستی کے دائرہ سے باہر ہے۔ ایک شعلہ بے تاب اور سورج سے بچھڑے ہوئے ذرہ کی طرح مضطرب اور وحشت زدہ' دعا و گریہ وزاری سے وصل کی خواہشمند ہے اور یہی عشق ہے' یہی ایک روح کا اپنے مبداء سے اپنے گھرانے سے' اپنی زادگاہ سے' اور اپنے شاندار وطن سے جدائی کا احساس ہے اور اسی کو عشق کہتے ہیں۔ عشق وصال اور تجدید اتصال کے لئے ایک دور افتادہ شخص کی حیرت' گریہ اور بیتابی ہے۔ اس خشک و بریدہ و غریب نَے کا نالہ ہے جو نیستاں میں اپنی بازگشت کا آرزومند ہے۔

تنہائی یا جدائی

مارٹن ہائیڈگر' سارتر' یا سپرس حتیٰ کہ "ہکت وارلیش فرم" جیسے بڑے مفکرین نے انسان کی تنہائی پر گفتگو کی ہے اور یہ تنہائی آج کے انسان کے فلسفے' آرٹ اور ادب کی روح ہو گئی ہے۔ اس لفظ کے انتخاب میں مجھ سے بھی غلطی ہو گئی' خاص طور پر حالیہ برسوں میں "جہاں بینی فلسفی" اور "انسان شناسی فلسفی" کے موضوع میں میری فکر کی بنیادی اینٹ اور میری منطقی سوچ' میری انفرادی زندگی کا فلسفہ تھا

جیسا کہ "کویر" نامی کتاب میں آپ میرے اس طرز تفکر کو دیکھ سکے ہیں اور اس دور کے فکری اور روحی بحران کو میرے دیگر آثار اور دیگر تحریروں میں بھی ملاحظہ کرسکتے ہیں اور یہ کیفیت اب بھی باقی ہے۔ لیکن جو اصطلاح میں نے اپنے اس اصلی احساس کے لئے انتخاب کیا تھا یعنی "تنہائی" اس میں مجھ سے غلطی ہوگئی، یعنی میں نے اس بات پر دھیان نہیں دیا کہ جو بات میں کہنا چاہتا ہوں ان باتوں کے ساتھ جنہیں سارتر، ہائیڈگر، نیشیلزم، نئے بے ہودہ "ازم" حتیٰ کہ آج کے مغرب کا "اگزسٹینسیلزم" کہہ رہا ہے یکساں نہیں ہے۔ ان کے زیر اثر مجھے بھی "تنہائی" (Solitude) کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہئے تھا بلکہ فلسفہ زندگی اور انسان شناسی میں اپنے اس بنیادی احساس کے بیان میں "جدائی" کا لفظ استعمال کرنا چاہئے تھا۔

واقعیت پسندی

آج دنیا میں دو طرح کی طرز فکر پائی جاتی ہے : ایک واقعیت پسندانہ، محسوساتی اور جدید "ریالزم" کہ جس میں فلسفے، ادبیات، آرٹ، فکر، روح، صنعت و حرفت، امیدیں، منتہای آرزو، اہداف،

سیاست، معاشرے، انفرادی اور اجتماعی زندگی کی راہ و رسم، علم الانسان کے فلسفے سبھی کو حقیقت کے دائرے میں محصور ہونا چاہیے۔ واقعیت کیا ہے؟ واقعہ یعنی وہ جو محسوس ہے، جو دیکھی جاتی ہے اور موجود ہے۔ یہ طرز فکر اور یہ میلان طبع بیسویں صدی پر چھائے ہوئے مشرق و مغرب کے تمام مختلف یہاں تک کہ متضاد مکاتب فکر کا مشترک پیشرو ہے : "مارک سیزم" کا بھی اور مغربی "سوشیالزم" کا بھی کہ جو حیات انسانی، اس کے آئیڈیل اور فلسفہ حیات میں سرمایہ دارانہ فکر و مزاج کے حامل ہیں۔ مادی طرز زندگی، اقتصادی طبقہ بندی اور سرمایہ کی ملکیت اور اس کی تقسیم و مصرف کی نسبت کیمونزم اور کیپیٹلزم میں کیا فرق ہے؟ یہ دونوں ہی زندگی اور انسان کو مادی منافع اور اقتصادی خصائص کی بنیاد پر یکتا حیثیت دیتے ہیں اور دونوں (دنیا) کے اقتصادی اور مادی "ریالسٹ" ہیں۔ پریگمازم، میٹریالزم اصالتِ نفع (Utilitarisne) اصالتِ آزادیِ فرد (Liberalisme) (کہ جس کا مقصد پیداوار، تقسیم، فروخت، اورمارکیٹنگ میں تجارت کی آزادی، اور کیپٹیلزم، کیمونزم، کلکٹیوازم (Collectivisme) (باہمی ملکیت)، اصالت اعتقاد (Economisme)، اصالت زیست (Biologisme)، اصالت طبیعت (Naturalisme)، اصالت فرد

(Individualisme) حتیٰ کہ پروٹسٹوں کی مسیحیت (Protestantisme) کو بھی موجودہ نظریہ اور نیز آرٹ اور ادبیات میں اور ہر اس چیز میں کہ جو زندگی، سماج، جبلت، اخلاق اور جنسی افعال اور انحرافی یا غیرانحرافی روحی تمایلات میں رائج ہے، گھسیٹا گیا ہے اور اسی میں غلیظ بازاری، فرویڈ ازم، سماج کے کونے کھانچوں میں چھپی ہوئی بدعملیاں، لوگوں کے مخفی روابط، پس دیوار اور اندھیروں کی سیاہ کاریاں، غیرفطری اور غیرشرعی میلانات میں انسانی روح کے پنہاں اور آشکار زاویئے، ان کی تشہیر، کاغذ پر ان کی چھاپ اور کھلے عام بلکہ تاکید و اصرار سے اسٹیج پر انکی نمائش اور بچوں تک کو یہ تماشے دکھانا، شامل ہے۔

یہ ہے جدید ریالزم یا اس کی صورتیں، لہٰذا جدید ریالزم صرف ایک خاص فلسفی مکتب نہیں بلکہ یہ نئے دور کے انسان کی مشترک روح و رفتار اور نئے تہذیب و تمدن اور طرز تفکر کی مظہر ہے کہ جو رنسانس کے دور سے یعنی قرون وسطیٰ کے آغاز خروج سے ---کہ جو مذہب، روحانیت، خداپرستی، واقعیت کی نفی، آخرت کے خوف، مادیت سے دوری، نفس کشی یعنی ماوراء کی سمت کشش، بلندیوں تک پہنچنے اور حقیقتِ متعال کا قرب حاصل کرنے کے لئے اپنی خواہشوں کو مارنے کا دور تھا--- آج تک ہر پہلو سے (فلسفے، آرٹ، ادبیات، زندگی،

معاشرے اور سیاست سبھی میں) حتیٰ کہ اپنے متضاد مکتبوں (سوشیلزم اور کیپیٹلزم) میں بھی مغربی طرزِ فکر کی علامت ہے۔ اس لئے کہ اس نے ان سب میں ایک ہی روح پھونکی تھی اور وہ "بورژوازی یا سرمایہ دارانہ روح" تھی۔ اس لئے کہ "عصرنو" (پندرھویں اور سولھویں صدی سے اب تک)---کہ جو قرون وسطیٰ (پانچویں صدی سے پندرھویں صدی تک) کے برابر ہے--- بنیادی طور پر ترقی' کامیابی اور فیوڈل طبقے (قرون وسطیٰ) پر بورژوازی طبقے کی حاکمیت کا دور ہے اور یہ فطری بات ہے حتیٰ کہ کمیونسٹ بھی کہ جو طبقاتی اعتبار سے اس کی ضد ہے' روح میں' فکر میں' انسانی صفت میں' زندگی اور جہاں بینی میں اس سے مشابہ ہے' اس لئے کہ اسی روح سے مشعب ہوئی ہے (نکلی ہے) اور یہی ایک فرق ہے جو مغربی سوشیالزم کو مشرقی سوشیالزم سے جدا کرتی ہے جو مشرقی تمدن' تاریخ اور مذاہب میں ایک حیثیت کی حامل ہے۔

واقعیت گریزی "آئیڈیالزم"

اس کے مقابل بطور مطلق اور بطور جامع جدید آئیڈیالزم یا تجرد

پسندی، جدید فلسفی آئیڈیالزم، جدید فنی، ادبی، حتیٰ کہ فطری اور ادراکی آئیڈیالزم اور نفی ذات کی آئیڈیالزم ہے کہ جو عالم واقعیت سے کہیں زیادہ بلند ہے اور عالم واقعیت کو اپنی معراج کے زیر قدم رکھتی ہے۔ اس کے سامنے عالم واقعیت کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ معاشرے سے الگ، فطرت سے الگ، واقعیت اور عینیت رکھنے والی ہر شے اور ہر محسوس بے قدر چیز سے الگ اپنی روح کی تکامل، اپنے باطن کی اصلاح، اپنے ذہن کی پرورش اور اپنے ذہنی استعداد کی دریافت کے پے در پے رہے۔ جتنا وہ عالم واقعیت سے، روزمرہ کی اجتماعی زندگی سے، عینی اور مادی ضرورتوں سے اور طبیعت و تقلید سے، اپنے تعلق کو مستحکم کرے گا اتنا ہی پستی کا شکار ہوگا۔

ذہن کی طرف رجعت، تجرد، خود فہمی، باطل نگری، اور ایک جملے میں : واقعیت سے گریز یا عینیت سے عصیان، آج ماڈرن ادبیات اور ماڈرن سوچ کی نمایاں خصوصیات اور امریکہ اور مغربی یورپ کے فن کی پیہاور موج ہوگئی ہے اور اس کا دامن پستی کی طرف جانے والے ملکوں کے انٹلکچولز، یہاں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں اور خاص طور پر روسی معاشرے کے لکھنے والوں اور با ھنر لوگوں تک پھیل گیا ہے۔ یہ ایک نئی موج ہے کہ جس نے اس جدید ریالزم کے سامنے کہ جو واقعیت سے چمٹی ہوئی ہے سرکشی کی ہے اور اس کوشش میں ہے کہ

واقعیت سے فرار اختیار کرے۔ اس عظیم موج کی نمایاں خصوصیت عینیت سے جدائی، محسوس واقعیت سے گریز، ذہن سازی، نفی تقلید اور نیز طبیعت، سماج، زندگی، تمدن اور فنون و ادبیات کی ریالزم کے آگے خود سپردگی ہے۔

یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ یہ ایک انسان کو بیگانہ اور دنیا سے دور کرتا ہے اور صرف اس لئے کہ خود آگاہ ہے، اس لئے کہ عالم آگاہ ہے، محسوس کرتا ہے، سمجھتا ہے اور اسی طرح اس باعث کہ وہ خلق کرسکتا ہے، طبعی کائنات کے مادی موجودات سے بالاتر ہے، اس لئے کہ طبیعت یا فطرت بذاتہ آگاہی اور شعور سے عاری ہے، اس میں مبتکرانہ خلاقیت یا ارادے کا فقدان ہے، یہ انسان ہے کہ جو ارادہ کرسکتا ہے، انتخاب کرسکتا ہے، پیکر وجود میں لاسکتا ہے اور ساتھ ہی جو کام وہ انجام دیتا ہے اور وہ دنیا جو اسے گھیرے ہوئے ہے اس سے بھی آگاہی رکھتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ مادی دنیا سے برتر اور بالاتر ہے۔ یہ آئیڈیالزم یا جدید تنہائی پسندی انسان کو واقعیت سے، بیرونی دنیا سے اور ان سب چیزوں سے بالا و برتر جانتی ہے جنہیں عینی احتیاجات اور مادی محسوسات بناسکتے ہیں اور پیکر وجود عطا کرسکتے ہیں۔ فن دراصل انسان کی مادی زندگی کی تکمیل کے لئے اس کی صلاحیت و استعداد سے عبارت ہے۔ ہم کس طرح جدید مادی ریالزم

کے مطابق اس طرح کی صلاحیت کو اپنی مادی زندگی میں محصور کر سکتے ہیں؟ یہ انسان کی فنی خلاقیت کا قتل ہے اگر ہم انسان کو اس کے مادی مفہوم میں لیں تو اسے انسان کی سطح سے گرادیں گے اور موجودات عالم میں فطرت کی ایک مرئی شے گرادنیں گے اور اگر انسان کو ایک مادی حیوان اور سوفیصد عنصری وجود دیں گے تو فن مرجائے گا اور اگر اسے محسوس اور عینی مادیت کی سطح پر لائیں گے تو فلسفہ کی موت واقع ہوجائے گی اور اس طرح انسان کی خلاقیت، آگاہی، تعمیری عمل اور وسعتِ امکانِ تخلیق، محصور و منجمد و متوقف ہوجائیں گے اور اس کے نتیجے میں آج کی جزمیت (ڈگمائزم)، انسانی اقدار کی حقارت، دائرہ احساس کی تنگی، دامن عصیان کے ، اور انقلاب و ابداع ؛ ماوراء محسوس خلاقیت کی محدودیت، انسان کی فکر، روح، اخلاق، زندگی، ثقافت، آنے والے وقت اور یہاں تک کہ نوع بشریت میں در آئے گی۔ جیسا کہ ہم آج، عصر حاضر کے انسان کو دیکھ رہے ہیں کہ وہ مقتدر مگر کم وقعت ہے۔ وہ ایک متمدن معاشرے کا وحشی فرد ہے۔ اس کی پرواز کشش زمین کی گرفت سے باہر لامتناہی فضاؤں تک ہے، لیکن اس کے باطن کی بلندی ایک ایسے گھٹیا فریبی سوداگر کی سطح تک ہے کہ جو صرف اپنے فائدے اور اپنی لذت و طاقت کو دیکھتا ہے اور بس۔

لیکن پست بورژوازی (سرمایہ داری) ریالزم، اس کے شدید رجحانات اور مغرب کی نوجوان نسل اور انٹلکچولز کی نافرمانی کے مقابل عصر حاضر کی تنہائی پسندی، باطن نگری، واقعیت اور مصرف سے گریز اور مادیت و فطرت سے روگردانی کی لہر، ایک جھوٹی، خیالی اور بھڑاس بھری معنویت پسندی ہے، جو ایک طرح کی سطحی درویشانہ صوفی گری، ہمارے اندر کی ملامتی تحریک اور "رفاہ" کے کوکھ سے نکلی ہوئی وہ زھدپسندی ہے کہ جو غفلت، عینیت سے دوری، واقعیت سے فرار اور مادیت کو جنم دیتی ہے۔

"مرفہ" (خوش حال) کون ہے؟ مرفہ طبقہ وہ طبقہ ہے جو کھاتا ہے اور کام نہیں کرتا، جو دوسروں کی محنت مزدوری کو ڈکارتا ہے۔ یعنی وہ کام کاج، محنت، مشقت، محرومیت، مشکلات اور کام کے ان ناہنجار شرائط کو سمجھے اور لمس کئے بغیر مصرف کرتا ہے۔

اس بناء پر "مرفہ" طبقہ زندگی کی واقعیت اور زندگی سے رابطے اور آشنائی کے بغیر کھاتا ہے اور زندگی گزارتا ہے۔ "رفاہ" اس طرح وجود میں آتی ہے۔ آسودگی اور آسائش یعنی عینی زندگی سے فراغت اور اس سماجی واقعیت سے غفلت کہ جس میں کام اور پیداوار کی ریل پیل ہے اور جہاں عام انسان سانس لے رہے ہیں اور تکلیف و شکیبائی کی منزل سے گزر رہے ہیں۔

سماجی طبقاتی نظام میں "قانون" اسے "حق" دیتا ہے' "کھانے کا حق۔" کام کا نہیں' شائستگی کا نہیں حتیٰ کہ "نیاز یا حاجت" کا نہیں! مرفہ آدمی کی زندگی بڑی آسودہ ہے۔ اسے کسی بات کا کھٹکا نہیں۔ ہر چیز اس کے لئے فراہم ہے۔ کوئی کمی' کوئی ضیاع' کوئی احتیاجی زحمت' دخل و حصول کا کوئی دغدغہ' نہ ملنے یا نہ پانے کا کوئی ڈر خوف اور احساسِ محرومیت کا کوئی وسوسہ اس کی روح کو آشفتہ نہیں کرتا۔ لازماً" یہ باتیں اسے آرام و آسودگی فراہم کرتی ہیں۔ وہ نہ کوئی کام کرتا ہے کہ اس کو کام کے نتیجے کی فکر ہو۔ نہ اس کی کوئی ذمہ داری ہے کہ وہ اس ذمہ داری کا پورا کرنے کا پابند ہو' نہ اس کو جستجو کی مجبوری ہے کہ جس کے سبب اسے کامیابی یا ناکامی کا خوف ہو' نہ وہ تکلیف سہتا ہے تاکہ تکلیف سے فرار کے درپے ہو۔ نہ اس کی کوئی الجھن ہے کہ جس سے چھٹکارے کے لئے وہ بھاگتا پھرے' نہ وہ ناکام ہے کہ کامیابی کے لئے کوشاں ہو' نہ وہ بھوکا ہے کہ اسے روٹی کی فکر ہو' نہ وہ کسی کمی یا محرومیت کا شکار ہے کہ اس کا کوئی ہدف ہو۔ نہ اسکے ذمہ کوئی کام یا ذہنی مشغولیت ہے کہ جس میں اس کا وقت کٹ سکے۔ وہ ان تمام واقعیتوں سے فارغ ہے' وہ انسان کہ جس کے پاس ضرورت کی ہر چیز ہے اس بات سے دکھ اٹھاتا ہے کہ وہ نہیں جانتا کہ کس چیز کو طلب کرے۔ ایک ایسا انسان جس کی زندگی میں کوئی

الجھن، کوئی جستجو، کوئی سعی و عمل اور کوئی کمی نہ ہو اس کے پاس نہ امید ہے اور نہ ہدف اور نتیجتاً" وہ ایک عضو معطل ہے۔ اس کی زندگی کی کوئی جہت نہیں، اس کا وجود بے معنی ہے، اس کے لئے جینے اور رہنے کا کوئی بہانہ نہیں۔ یہ دنیا بھی اس کے لئے کوئی مفہوم نہیں رکھتی۔ ایسا انسان فطرتاً" بے ہودگی کی راہ اختیار کرتا ہے، واہیات کا معتقد ہو جاتا ہے اور پھر انسان کو، دنیا کو اور ہر چیز کو عبث سمجھتا ہے۔

عبث اور بے ہودگی کا فلسفہ یہیں سے شروع ہوتا ہے، اسی فلسفی جہاں بینی اور طبقاتی جہاں بینی سے۔ ایک بورژدا، وہ Absurdite شخص ہے جو آج کے مغرب کی روح اور اس کا رائج فلسفہ ہے، وہ "آلر کامو" کا فلسفی انکشاف نہیں ہے، مسٹر "ساموئل بکت" کی فطانت کی تخلیق نہیں ہے۔ عظیم مغربی مفکروں کی فہم و فراست، حقیقت یابی، اور فلسفی اعجاز نہیں ہے۔ فرنگی ذہن کی تراوش نہیں ہے، فرنگی پیٹ کی ترشح (ٹپکاؤ) نہیں ہے، شکم سیر فرنگی! وہ فرنگی کہ جو کھاتا ہے اور افریقی اور ایشیائی لوگ اس کے لئے کام کرتے ہیں۔ ایک گھنٹے ازروئے تفنن (تفریحی انداز میں) کام کرتا ہے اور ۱۰۰ مارک لیتا ہے اور باقی جتنا ناچتا ہے، پیتا ہے، "بالماسکیو" (Bal Masque ۔ خاص قسم کے رقص کی محفل) سجاتا ہے،

کارناوال (Carnaval ۔ جوکرانہ انداز کے پرمذاق تفریحی جلوس) نکالتا ہے اور دیگر مشغلے (Amusement) کہ جو مغربی طرز زندگی کا ہدف ہیں ڈھونڈتا ہے پھر بھی فراغت کی گھڑیاں اسے ملتی ہیں اور وہ نہیں جانتا کہ ان میں کیا کرے' بغیر محنت مشقت کے کھانا اور تفریح کرنا انسان میں آہستہ آہستہ اکتاہٹ لاتا ہے اور یہ انسان دنیا کو ھیچ در ھیچ دیکھتا ہے' اس میں یکسانیت پاتا ہے۔ وہ کسی بات سے نہیں ڈرتا' کوئی خوف و ہراس اس کے پاس نہیں پھٹکتا' اسے کسی کمی اور کسی ڈر کا احساس نہیں ہوتا' اسکا کوئی ہدف یا مقصد نہیں ہوتا۔ بنیادی طور پر زندگی اسکے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی ۔ اسے معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیوں جی رہا ہے؟ زندگی میں خلا' دنیا میں خالی رہنا' جینے میں بے معنی جینا' انسانی وجود کا فلسفے سے خالی ہونا اور ہر شے کا ھیچ ہونا اسکی نظر میں مجسم ہوتا ہے۔

جدید فلسفے اور جدید آرٹ میں لغویت' بے معنی تھیٹر' مہمل فلسفہ اور جہاں بینی یہیں سے وجود میں آتی ہے' اسی پوچ انسان اور عبث زندگی سے۔ اس لئے کہ وہ انسان کہ جو معاشرتی زندگی میں جینے کے لئے کوئی مشغلہ' کوئی وابستگی' کوئی کام' کوئی جدوجہد اور کوئی ذمہ داری نہیں رکھتا اس کی زندگی خالی اور یکسانیت کا شکار ہوتی ہے۔ بورژوازی طبقہ میں اس خلا کو بھرنے کے لئے یورپ کا فن اور یورپ

کا فلسفہ وجود میں آتا ہے اور وہ کہتا ہے : "آسمان خالی ہے' دنیا بے خرد ہے' ہستی' شعور و تدبیر سے فاقد ہے اور وجود' نادانی یا ضعف عقل پر استوار ہے۔" اور سچ بھی کہتا ہے۔ وہ اپنے وجود کے بارے میں کہتا ہے' اپنے طبقاتی دنیا کے بارے میں کہتا ہے اور سچ کہتا ہے کہ حیات کچھ نہیں' ہنر کچھ نہیں' مقصد خلقت کچھ نہیں......! اسکا ہنر مشغلے تراشنا اور مصروفیت ڈھونڈنا ہے۔ آپ نے بعض اوقات ان کی وہ فلمیں دیکھی ہیں جن میں وہ اپنی شب کی محفلوں میں ایسے کھیلوں' ایسے کاموں' ایسے شو یا ایسے (Representations) کی تلاش میں ہوتے ہیں کہ جو ہیجان آور' اضطراب آور اور محرک ہوتی ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ ان کی زندگی میں اضطراب نہیں' ان کے طبقے میں اضطراب نہیں' اس لئے کہ عمر کے آخری حصے تک ان کی زندگی میں کوئی حادثہ رونما نہیں ہوتا۔ انہیں بھوک' غربت' کام' کمی' نقصان' احتیاج اور محرومیت کا کھٹکا نہیں ہوتا' وہ شخص کہ جو مسلسل یکساں نوعیت کی جامد زندگی گزار رہا ہو اس کا دل اچاٹ ہوجاتا ہے اور یہ زندگی اس کے لئے دوبھر ہوجاتی ہے اور وہ ایسی چیزیں ڈھونڈتا ہے جس میں ہیجان ہو' ذہنی اشتعال ہو' عجیب و غریب مخلوق کے مناظر ہوں' نظربندی ہو' ارواح اور اجنہ کا احضار ہو' اسے ہر اس چیز کی طلب ہوتی ہے کہ جو اس کے حیرت و ہیجان میں اضافہ کرے۔ یہ وہ

جھوٹی بازگشت ہے کہ جس میں آج کے یورپ نے ' ذہنیت پسندی اور بقول خود ان کے اور دیگر بہت سی تعبیروں کے ' معنویت پسندی ' مشرقی پسندی ' قدیم رائجہ مخفی علوم اور غیبی انحرافی مسائل کی طرف رخ کیا ہے۔ یہ رجحان کہ جو آج مغرب میں پیدا ہوا ہے ' واقعیت سے آسودہ اور زندگی کی حقیقت سے فارغ روح کا انحرافی رجحان ہے۔

جس منتہای آرزو کا میں نے ذکر کیا یعنی مغربی معنویت پسندی ' خودنگری ' باطن نگری ' اور انسان دوستی وغیرہ اس کی بنیاد اس بات پر ہے کہ انسان تنہا ہے ' بقول "ھائیڈگر" : "انسان ' اس صحرائے فطرت کے سینے پر دھکیل دیا گیا ہے ' یہاں اس کا کوئی ذریعہ تمسک نہیں ہے ' انسان خدا کا عاق کیا ہوا ہے۔" یہاں تک کہ "آلبر کامو" کہتا ہے : "میں نافرمانی کرتا ہوں ' مگر کیوں؟ اس لئے کہ دنیا میرے انسان ہونے کی صفت کے برخلاف ہے۔ کیونکہ اس کی بنیاد ظلم و ستم اور انسان کی نسبت جارحیت پر قائم ہے اور مجبوراً " میں خدا کے خلاف اعتراض کرتا ہوں! لیکن خدا کا وجود بھی نہیں!" مرحبا! ہوا میں گھونسے مارنا! یہ تو کوئی پہلوانی نہیں ہوئی ' میں اس کے خلاف اعتراض کر رہا ہوں جس کا کوئی وجود نہیں! یہ کس طرح کی نافرمانی اور اعتراض ہے؟ نافرمانی اس کی جو نہیں ہے ' اعتراض اس پر کہ جس کے بارے میں تم خود کہتے ہو کہ نہیں ہے؟

یہ تمام فلسفے، سارتر کے "شکست" کا فلسفہ، آلبرکامو کا مہمل فسلفہ "آندرژید" کا فعل عبث "ہائیڈگر" کی "بیگانگی"..... یہ سب ایک واقعیت کی مختلف تعبیریں ہیں اور یہ واقعیت جدید تمدن میں انسان کے روح کی بے چینی ہے۔

"آندرہ ژید" ایک بہت بڑا مفکر ہے، وہ کہتا ہے، انسانی زندگی کے تمام اعمال عبث ہیں (Absurds) اس سے پوچھا گیا، عبث کیا ہے؟ کہا : "عبث اس شخص کے عمل کی طرح ہے کہ جو صبح گھر سے باہر نکلتا ہے، بڑے مودب، موقر اور محترم انداز میں، موڑ پر اسے ایک اور محترم، موقر اور بڑی نامور ہستی ملتی ہے اچانک بغیر کسی تمہید اور بغیر کسی جان پہچان کے دھڑسے وہ اس کے منہ پر ایک طمانچہ مارتا ہے! بعد میں طمانچہ کھانے والا اعتراض کرتا ہے کہ آخر کیوں؟ طمانچہ مارنے والا جواب دیئے بغیر اپنی راہ چل دیتا ہے۔ دوسری صبح وہ طمانچہ کھانے والے کو باضابطہ طور پر ایک تحریر لکھتا ہے اور اپنے کل کے عمل سے معذرت کرتا ہے۔" اب بتایئے اس عمل کا مفہوم کیا ہوا؟ کچھ نہیں! یہی ایک عبث کام کا مفہوم ہے۔

اس وقت ہماری زندگی صبح سے شام تک اسی طرح ہے۔ ہم اپنی زندگی میں اسی طرح کے کام انجام دیتے ہیں۔ تاہم جب ہم کسی کو مارتے ہیں تو چونکہ بعض لوگ ہمارے ہمنوا ہیں اور وہ بھی یہی کرتے

ہیں اس لئے ہمارا عمل منطقی دکھائی دیتا ہے اور جب مار کھانے والا اعتراض کرتا ہے اور اس کے اعتراض سے دوسرے اتفاق کرتے ہیں تو یہ کام بھی منطقی ہوتا ہے، لیکن مجموعی طور پر وہ تمام اعمال و حرکات کہ جو انسان کی زندگی کو زمین پر گشت میں لاتے ہیں وہ سب عبث ہیں۔ یعنی بے ہودہ ہیں، ابلہانہ ہیں، مضحکہ خیز ہیں، خلاف واقع ہیں اور بے معنی اور بے ہدف ہیں!

یہ آج کی مرفہ بورژوازی زندگی ہے کہ جو اس طرح ہے، آخر کیوں یہ تمام فلسفے دنیا کی بے معنویت پر آکر ختم ہوتے ہیں؟ اس کا بنیادی سبب وہ پروپیگنڈہ ہے جسے اٹھارویں اور انیسویں صدی کی تاجرانہ مادی فکر نے ہوا دی تھی اور جو انسان کی ساری ضرورتوں، ساری چاہتوں اور سارے احتیاجات اور احساسات کو اس کے مصارف و فلاح کی زیادہ سے زیادہ تکمیل میں محصور جانتا ہے۔ تاہم اس کے برعکس اونچے درجے کے مفکرین اور صاحبان فکر و نظر نے کبھی اس کی تائید نہیں کی اور کہا کہ انسان کی، ماورائے مادی احتیاجات بھی ہیں بقول علامہ اقبال : "لوگوں کو دنیا کی ایک روحانی تفسیر کی ضرورت ہے، انہیں دنیا میں ایک اعتقادی منزل، ایک روحانی اتصال، ایک مرکزِ جذبِ احساس، ایک مرکزِ امید اور بشریت اور کائنات کے لئے ایک مفہوم کی ضرورت ہے اور وہ اسے نہیں

ڈھونڈپاتے۔" یہ عالم بشریت اس زمین سے' اس کی پیداوار سے' اس کے مصرف سے اور یورپی خوشحال زندگی کے مصارف سے بے زار ہے' وہ اس عالم میں کمی کا احساس کرتی ہے اور جو کچھ یہاں ہے اس تک بھی نہیں پہنچتی۔ لہٰذا خودبخود ھیچ و پوچ سے متصل ہوتی ہے' موجودہ شے سے بے زاری اور پوشیدہ سے' جہل و انکار' یہ مہمل تک پہنچنا ہے' کھوکھلا پن ہے' خلا میں اٹکے رہنا ہے جہاں یورپی فکر پہنچی ہوئی ہے اور آج کا یورپی فن اور فلسفہ جارہا ہے۔ یہ اس خودپسندی کا مفہوم ہے کہ جس کی بنیاد تنہائی پر ہے۔ آدمی کا تنہا ہونا اور انسان کا اپنی ہستی میں تنہا ہونا خودبخود اسے یہاں تک لاتا ہے۔ وہ آدمی کہ جو روزانہ کی زندگی' آمدنی' رتبے' فائدے اور لباس و غذا کا اسیر ہوتا ہے وہ بھی خوش نصیب ہے' بھاگوان ہے' بہشت میں جیتا ہے' ایک حیوانی بہشت اور نباتی آسودگی میں۔ بقول "لاؤتسو" : ایک درخت جیسی آسودگی' ایک بوٹی جیسی سیری اور سیرآبی۔

لیکن جو شخص ان احتیاجات سے آگے قدم رکھتا ہے وہ غربت و تنہائی اور اکیلاپن محسوس کرتا ہے۔

لیکن دعا اس روح کی تجلی سے عبارت ہے کہ جو اس گھٹیا ریالزم' اور واقعیت پسند سطحی موجود (دنیا) کی طرح ہستی کے ادنیٰ دائرے میں محصور نہیں رہنا چاہتی وہ ہر موجود ہستی کی پستی سے گھبراتی ہے اور

مادی احتیاجات اور جو کچھ اس کی دسترس میں ہے اس سے بلند تر احتیاج کی حامل ہے۔ وہ بلند تر تک پہنچنے اور عالی تر احتیاجات کو حاصل کرنے کے درپے ہے اور اسی کوشش میں وہ اس اجنبی دنیا میں بے کس و تنہا اور مادی زندگی میں نقصان کا شکار رہی ہے، لیکن آج کی یورپی روح کی تنہائی کی طرح دنیا کی لغویت کی قائل نہیں اور اس میں موجود یہ نیاز و اضطراب و کشش، تنہا ایک روح سے مربوط و منسوب نہیں بلکہ ایک والہ و شیدا روح سے منسوب ہے، ایک ایسی روح سے کہ جو سب سے کٹی ہوئی، سب سے جدا اور سب سے الگ تھلگ ہے۔

وہ لفظ جس کے لئے میں کہہ رہا تھا کہ مجھے "تنہائی" کی جگہ لانا چاہئے تھا "جدائی" ہے۔ رنج و تلاش و اضطراب و احساس و باطن میں سمایا ہوا عشق اور وہ فکر کہ جس سے مذہب و عرفان و صنعت نے جنم لیا ہے سلسلہ تاریخ بشر میں جدائی کی پیداوار ہے۔ احساس جدائی، احساس تنہائی نہیں۔ تنہائی اور جدائی میں کیا فرق ہے؟ تنہائی یعنی "بے کسی" اور جدائی یعنی "اس سے علیحدگی" اس کے بغیر جینا۔ اس کے بغیر جینا یعنی اس کو اپنے اندر رکھنا اور اس سے جنون کی حد تک محبت کرنا اور اس طرح ہستی میں، عالم میں، وجود میں، جہت کا حامل ہونا۔ کسی بزرگ یا بلند و برتر ہستی کی سرپرستی کا ارمان گویا ہستی

میں انسان کا پتہ یا سراغ ہے۔ یعنی انسان ایک جز ہے' جدا افتادہ' منفرد اور اگر اسکو ایک مردہ اور جامد جز کے عنوان سے اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ قدرت کے دیگر اشیاء جیسا ہوگا' اس پر خوف طاری ہوگا' اس کی کوشش ہوگی کہ وہ اپنے آپ کو کسی بڑی ہستی سے' کائنات کے عظیم مرکز حیات سے وابستہ کرے' وہ ترقی و خوشحالی کے درپے ہوگا۔ اسے بلند سے بلند تک پہنچنے کی حسرت ہوگی۔ وہ گریز اختیار کرے گا' بیزاری دامن گیر ہوگی' اسے ہمیشہ اپنی حالت کی نسبت خوف رہے گا اور یہ اپنی حالت سے گریز' فرار سے رغبت اور اس سمت کا رخ کہ جو ناپیدا' بلند اور مطلق ہے اور نیز عشق سے مغلوب' مضطرب' بے تاب اور خوفزدہ روح' ایک بلند پایہ انسان کو وجود میں لائے گی اور دعا یعنی اپنی پوری قوت اور اخلاص کے ساتھ اس بات کو چاہنا کہ میں ایسی حالت' ایسی کیفیت اور ایسی سطح پر نہ ہوں' اپنی پوری قوت اور پورے امکان و اخلاص کے ساتھ یہ چاہنا کہ میں اس ترقی و تکامل کی راہ پر چل نکلوں۔ اس لئے کہ بقول "الکسس کارل" :

"دعا' کائنات کے عظیم اور پراسرار روحانی مرکز کی طرف انسان کے روح کی پرواز ہے۔"

کون شخص دعا کرتا ہے؟ جن باتوں کو قابلیت سے' کام کاج سے' اور غور و فکر سے حاصل کیا جانا چاہئے ان میں زور دعا کو دخل نہیں۔

دعا کرنا یعنی چاہنا یعنی نعرہ کی طرح، اعتقادی اصول کی تلقین کی طرح اپنی چاہتوں اور ضرورتوں کی تکرار، یہ وہ تازیانہ ہے کہ جو انسان کے مقدس آئیڈیلز اور درخواستوں کو تازہ رکھتا ہے تاکہ روح روزانہ کے پست اور گھٹیا مادی عینیت کے درپے نہ ہو۔

دعا صرف اس موجود زندگی کی ضرورتوں کا چاہنا نہیں ہے بلکہ بلند پایہ دعا زندگی سے بالاتر ضرورتوں کا چاہنا ہے۔ کون شخص دعا کرتا ہے؟ کون، شدت، لگن، اضطراب اور خشیت سے "مانگتا" ہے؟ وہی کہ جس میں "جو کچھ ہے" اور "جو کچھ ہونا چاہئے" کے درمیان کا فاصلہ بڑھا ہوا ہے۔ یہی شخص مضطرب ہے۔ یہی شخص ہمیشہ کا طلب گار، مشتاق، حاجت مند اور پیاسا ہے اور یہی شخص دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہے۔ لیکن وہ شخص کہ جس کے لئے یہ دو حالتیں تلے اوپر منطبق ہیں یا ان کے درمیان کا فاصلہ کم ہے اور ایک رتبہ کا صدور اس فاصلہ کو ختم کردیتا ہے اس کی دعا بھی اسی نسبت سے کم اور سطح کے اعتبار سے نیچی ہے اور یہ کارخانہ عالم اور دعا کرنے والے انسان کا مخاطب کہ جو ایک بلند پایہ دعا کرنے والے کی وہ جہت ہے جو اسے بلندی عطا کرتی ہے اس کی نظر میں صرف مشکلات کو حل کرنے والا یا انسان کی سستی اور کم ہمتی کا ازالہ کرنے والا ہے، حالانکہ ایک تشنہ و دلدادہ عظیم روح کے لئے دعا، ابدیت کی سمت معراج ہے، اس چوٹی

کی سمت پرواز ہے کہ جو ابدیت سے ملی ہوئی ہے۔ اس مرکز کی سمت بلند ہونا ہے جو ہر شے سے ماوراء ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ اسلامی دعاؤں کے بارے میں گفتگو کے لئے میرے پاس وقت نہیں ہے۔ اس لئے کہ کافی دیر ہوچکی ہے لہٰذا میں صرف تحقیق کے ایک میتھڈ کی گفتگو پر اکتفا کرتا ہوں تاکہ حاضرین میں اگر کوئی اس آرزو کا حامل ہو جو مجھے تھی اور میں اس پر عمل نہ کرسکا اس میتھڈ کی ساتھ مجھ سے زیادہ بہتر انداز میں اس پر عمل پیرا ہو اور یہ، علمی میتھڈ کے ساتھ، اسلامی دعاؤں کے متون پر ایک علمی کام ہے۔

اسلامی دعائیں ایک جملے میں، دعا نہیں، ایمانی اور فلسفی تعلیم و تدریس کی وہ اصل ہیں کہ جو خدا سے خطاب کی صورت میں، احتیاجات کے بیان کی صورت میں، انسان کی درخواست میں، ایک انتہائی عمیق، لطیف، خوبصورت اور پراثر، جہاں شناسی، انسان شناسی اور خداشناسی کی مظہرہیں۔ میں یہاں اپنے ساتھ صحیفہ سجادیہ کے کچھ نمونے پیش کرنے کے لئے لایا تھا مگر اب وقت نہیں ہے۔ بنیادی طور پر اسلامی دعائیں دو حصوں پر مشتمل ہیں۔ پہلے مرحلہ میں خدا سے خطاب ہے۔ اس خطاب میں پڑھنے والا یا دعا کرنے والا، خدا کی صفات، خدا کی ذات، خدا کے مقام، کائنات کے ساتھ خدا کے رابطے، انسان کے ساتھ خدا کے تعلق، فرد کے ساتھ خدا کے رشتے

اور خداوند علی اعلیٰ کی عظمت وصفات اور اس کی تنظیم و تدبیر کو محل ذکر پر لاتا ہے صحیفہ کو اس خوبی سے زینت دی گئی ہے کہ اگر ہم خطابات کے جملوں کو سمیٹ دیں تو یہ خداشناسی کے سلسلے میں ایک اچھی خاصی فلسفی کتاب ہو جائے گی۔ وہاں دعا نہیں ہے 'کوئی خدا سے کچھ نہیں چاہتا' وہاں خدا سے خطاب ہے' یہ سارے خطاب اس قدر خوبصورت اور اس قدر عمیق و دقیق ہیں کہ جو خوبصورت ترین' دقیق ترین' لطیف ترین اور ساتھ ہی عمیق ترین صفات و استدلال اور خداشناسی کے اثبات کو انسان سے متعارف کراتے ہیں۔

دوسرا مرحلہ "چاہنے" یا "طلب کرنے" کا ہے جو اس سے مرتبے میں قدرے کمتر ہے۔ اس چاہنے کے عمل میں ہماری مروجہ مادی احتیاجات کے مطالبے کی صورت نہیں ہے بلکہ پسندیدہ صفات اور انسانی فضیلتوں کو اس سے چاہنا ہے اور جابجا اس کی تکرار ہے' اپنے لئے' اپنے گھر والوں کے لئے اور معاشرے کے لئے عدالت' سعادت اور خوش نصیبی کو طلب کرنا ہے۔ پستیوں' ذلتوں' محتاجیوں' تسلیمِ ظلم اور ستمگاروں کی نسبت سمجھوتے سے دوری چاہنا ہے اور انحطاط اور انسان کو کمزور بنانے والے موارد سے نجات کا خواستار ہونا ہے۔ اگر دعائی صورت کو ان سے نکال دیا جائے تو پھر بھی دستور اخلاق اور باہمی سماجی زندگی کے اصول ہمیں درس دیتے ہیں اور

انسان کو اس سے باخبر کرتے ہیں کہ ذلت اور ناتوانی کیا ہے اور صحیح سرمایہ سعادت' بلند و برتر چاہتیں اور انسانی زوال کے عوامل کونسے ہیں؟

اس دعا کی کتاب کے آخر میں میرا ارادہ تھا کہ اس کے ترجمے کے بعد میں اسلامی دعاؤں پر اپنی تحقیقات کو آگے بڑھاؤں' لیکن وقت نے میرا ساتھ نہیں دیا اور مجھے افسوس ہے کہ میں ایسا نہیں کرسکا' لیکن یورپ میں جب میں "کارل" کی دعا کی کتاب کا ترجمہ کررہا تھا تو میں نے سطحی طور پر اسلامی دعاؤں کا مطالعہ کیا اور ان عناصر کو ڈھونڈ نکالا کہ جو اسلامی دعاؤں کی تشکیل کرتے ہیں۔ ان میں ایک زبان کی فصاحت و بلاغت ہے۔

اسلامی دعاؤں کے متون زبان کے اعتبار سے نثر کے عالی ترین اور خوبصورت ترین ادبی اور فنی شہ پارے اور بیان میں فصاحت و بلاغت سے استفادے کے بہترین نمونے ہیں اور یہ کیفیت اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اسلام' زیبائی اور فن کی وقعت کو ---اس شرط کے ساتھ کہ وہ انسانی روح کی تکامل کے درپے ہو--- نہ صرف اہمیت دیتا ہے بلکہ اس کی اہمیت اور اس سے اپنا رشتہ جوڑنے کی شدت سے تاکید بھی کرتا ہے۔

دوسرے جملوں کے الفاظ اور سارے متن میں کلام کی موسیقی

ہے۔

ہر دعا تین متفاوت موسیقی کی حامل ہے۔ لفظ کی موسیقی، جملے، از نظر اشتقاق اور از نظر سجع یہ سب ایک دوسرے سے ہم آہنگی رکھتے ہیں اور نیز ہر لفظ اپنے تشکیل دھندہ حروف (اصوات) کے اعتبار سے ایک منظم اور موزوں موسیقی کا حامل ہے۔

اسی طرح ہر جملہ ایک عبارتی آہنگ سے ھم آہنگ ہے اور اسی ڈھب پر سارا متن ایک خاص منحنی صورت، ایک خاص تھیم (Theme)، ایک خوش آہنگ زیروبم اور دعا کے مضمون سے ہم آہنگ ایک مناسب اور بامعنی صوتی اتار چڑھاؤ کا حامل ہے۔ آواز کی یہ موزونی اور حسن کلام کی تاثیر انسان کی روح میں اس طرح جاگزیں ہوتی ہے کہ وہ روح کو عشق کے زیر اثر آنے، خدا کے حضور کھڑے ہونے اور دعا کو زیادہ رغبت سے اپنانے میں مدد دیتی ہے۔

تیسرے، اسلامی دعاؤں میں فکری عنصر ہے۔

فکری عنصر یعنی یہ کہ ساری اسلامی دعاؤں کا متن شروع سے آخر تک (صحیفہ سجادیہ اس کی مثال ہے) خدا شناسی، انسان شناسی، اخلاقی اصول، معاشرتی اصول، لوگوں کے ایک دوسرے پر حقوق، بشری آئیڈیلز کی گفتگو اور اسی طرح سماجی، انفرادی اور اخلاقی پستیوں اور خطروں سے خوف و گریز کی گفتگو پر مشتمل ہے۔

یہ بھی "چاہنے" اور "طلب کرنے" کی ایک قسم ہے' صرف کسی سے کسی چیز کا طلب کرنا نہیں ہے۔ چاہنا یا طلب کرنا' یعنی اس بات کا اعلان کرنا کہ میں حاجت مند ہوں' میں ہمیشہ ان حاجتوں کا خواہاں ہوں' یہ میرے مطالبوں کا اعلان ہے' یہ میری سطح' میری شخصیت' میرے تعہدات اور میری نظر میں میری زندگی کے مفہوم کا آئینہ دار ہے۔ دعا کے اس دوسرے رخ کی اہمیت' تکامل اور تربیت کے اعتبار سے پہلے رخ سے کمتر نہیں جو حاجت براری سے عبارت ہے۔

اسلامی دعاؤں میں' اور زیادہ تر شیعی مسلک کی دعاؤں میں بلکہ تقریباً" بطور مطلق شیعی دعاؤں میں' سیاسی اور معاشرتی عناصر۔

میری معلومات کے مطابق شیعی قیادت' خاص طور پر چوتھے امام کے زمانے سے بڑی سختی اور مشکلات کا شکار رہی۔ ہر طرف ظلم و ستم کا دور تھا' کسی کوشش اور کسی قیام کا امکان نہیں تھا۔ وہ آخری لشکر اور وہ فریاد اعتراض کہ جسے امام حسین علیہ السلام نے حکمران طبقے اور حالات کے خلاف بلند کیا تھا ختم کردیا گیا تھا۔ سب قتل کردیئے گئے تھے۔ بس اس انقلاب کا صرف ایک جوان باقی رہ گیا تھا اور وہ اہل تشیع کے چوتھے امام تھے۔ کام کو آگے بڑھانے کے لئے کسی فوجی اقدام' کسی سیاسی جستجو اور کسی قیام کا امکان نہیں تھا بلکہ بنیادی طور پر سیاسی اور سماجی صورت حال خطرناک تھی اور اس بات کا امکان

تھا کہ لوگ اسلامی معاشرے اور اسلامی طرز حیات میں دادخواہی' حق پرستی اور انسان دوستی کی اس تحریک کو بھول جائیں اور یہ مکتب' یہ راستہ' یعنی امامت' یعنی تشیع' پورے طور پر فراموشی کے دھندلکوں میں چلا جائے' سارے ذرائع ابلاغ' سارے محراب' سارے منبر' ساری مسجدیں' سارے قضات' سارے حکام اور ساری طاقتیں دست خلافت میں تھیں۔ صرف ایک ہستی تھی جو ان قوتوں کے آگے تنہا رہ گئی تھی۔ خونریزی' قتل عام اور اس قدر سخت' دشوار اور ہولناک ماحول میں دھونس' دھمکی' خوف' دہشت اور جرم و عصیان کی حکومت تھی۔ یہی وہ وقت تھا جب شیعی دعا نے قامت پکڑی' یہ ایک پناہ گاہ بلکہ ایک کمین گاہ کی صورت میں حملے کے لئے اور رہنے کے لئے عمل میں آئی۔ رہنے کے لئے' کون بھلا؟ یہ فکر' یہ مطالبات اور یہ ایمان کہ جس کے خلاف ساری اسلامی دنیا نے ایکا کرلیا ہے۔

کس پر حملہ ہوگا؟ اس مشینری پر کہ جس نے حملے کے سارے اڈوں اور قیام کے سارے امکانات کو لوگوں سے چھین لیا ہے۔ راہ حق میں دعا' بعنوان اسلحۂ جنگ کا مطلب یہ ہے کہ اگر مبارزہ کی ایسی منزل آجائے کہ جہاں فکر زد پر ہو اور دادخواہی اور حق طلبی کی تحریک کربلا جیسی صورت حال سے دوچار ہو کہ جس میں سوائے ایک فرد اور ایک جوان کے باقی سب قتل کردیئے جائیں۔ سارے بچے اور

ساری عورتیں قیدی بنالی جائیں یعنی اس حقیقت کے بچاؤ کے لئے کوئی طاقت باقی نہ رہے اور صرف ایک فرد بچ رہے تو وہ ایک فرد بھی ذمہ داری سے خالی نہیں ہے۔ وہ اس بات کا ذمہ دار ہے کہ اپنی روح کو اس شخص کے عنوان سے کہ جس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ اس فکر کو، اس احساس کو، اس یاد کو اور اس مسئولیت کو اپنے اندر زندہ رکھے، دعا سے سنبھالے رکھے اور پروان چڑھائے۔ اور ایک ایسے فرد کے عنوان سے بھی کہ جس پر اس فکر اور اس پیغام کی حفاظت، اس کے بچاؤ اور آئندہ نسل تک اسے پہنچانے کی ذمہ داری ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ دعا سے سماجی اور فکری مبارزہ کے لئے ہتھیار کا کام لے اور اس کی بہترین مثال "صحیفہ سجادیہ" اور امام سجاد علیہ السلام کی زندگی ہے۔

جناب امام سجاد علیہ السلام کے پاس نہ تو امام جعفر صادق علیہ السلام کی طرح تدریس کی صورت میں مبارزے کے امکانات ہیں، نہ حضرت امیر اور امام حسن علیہ السلام کی طرح فوجی اقدامات کا وجود ہے اور نہ ہی امام حسین علیہ السلام کی طرح شہادت کے لئے قیام کی کوئی راہ ہے، لیکن وہ اپنے قلب کے پوشیدہ ترین زاویوں میں نیز ہر محفل، ہر شخص اور ہر حالت میں دعا کے نام سے تشیع کے سارے اعتقادی اصول کو، خدا اور توحید کی نسبت ہماری شناخت کو جناب

رسالت ماب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نسبت ہمارے انداز فکر کو ---یہ سب صحیفے کے ابواب میں--- انسانی سجایا (خلق وخو) کی نسبت ہمارے عقیدے کی کیفیت کو امامت ائمہ اور حضرت علی علیہ السلام کی پیشوائیت سے متعلق ہمارے اعتقاد کو' امام حسن اور امام حسین علیہما سلام کے مبارزات کی سرنوشت کے بارے میں ہمارے عقیدہ کو' سماجی زندگی کے بارے میں ہمارے نظریہ کو' اہل ظلم اور جور و فریب کے اقتدار اعلیٰ کے خلاف ہمارے مصالحت ناپذیر عہد کی کیفیت کو' موثر ترین انداز میں بیان کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ہر حال میں خواہ کسی سوچ سے تمام فکری اور سماجی امکانات کو لے لیا جائے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی شخص یہ دیکھے کہ حقیقت اور سچائی کے بچاؤ کے لئے کوئی نہیں ہے تو دعا اس کے اس عمل کی اثبات ہے کہ اس نے مبارزہ اور دفاع کی ذمہ داری' اپنی فکر اور اپنے مکتب کو بچانے اور اس سے اپنے اتصال و وفاداری کے پیش نظر اور اس لئے بھی کہ یہ عقیدہ باوجود نامساعد حالات اور باوجود اقتدار اعلیٰ کی زور و زیادتی کے' ترویج پائے اپنی جنگ جاری رکھی' کس صورت میں؟ اس زمانے کی واحد صورت میں جب کسی شکل سے مبارزہ کا کوئی امکان نہیں تھا : یعنی دعا۔

ممکن ہے اس رخ سے یہ بات کہی جائے کہ یہ مبارزہ کا کمزور

ترین امکان ہے' ہاں' مگر دوسرے رخ سے اس بات کے پیش نظر ہم اس سے یہ نتیجہ حاصل کرسکتے ہیں کہ حکومت جور اور انسان دشمن نظام میں اگر ظلم و جبر کے مقابلے یا ایک مکتب ایک حقیقت یا ایک راہ کی دفاع کے لئے معمولی سا امکان بھی نہ ہو تو اس وقت بھی ایک تنہا انسان کو سماجی ذمہ داری سے معاف نہیں رکھا جاسکتا۔ اس استثنائی حالت میں بھی انسان کی یہ ذمہ داری ہے کہ ہر ممکنہ صورت سے جہاد کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو۔ پس صورت حال کچھ بھی ہو انسان سے کبھی سلب مشسولیت نہیں ہوتی۔ کتنی ہی ذہنی اور ادائیگی فرض کی مشکلات کا سامنا ہو اس بات کی گنجائش نہیں کہ انسان خود' اپنے آپ کو نفرین کرے' اسے چاہئے کہ وہ اپنے افکار و عقائد کو دعا کی صورت میں زبان پر لائے اور اپنی تمناؤ' اپنی شکایتوں' اپنے دکھوں' اپنی آرزوؤں اور اپنی محکوم اور کچلی ہوئی انسانی اور ایمانی خواہشوں کو خدا کے سامنے پیش کرے' اپنی سماجی اور فکری منزل کو کم از کم اپنے احساس میں اجاگر کرے۔ اپنے ایمان و ایقان کو اپنی ذات میں تلقین کرے۔ وہ اس امکان سے محروم نہیں ہوسکتا اور حاکم قوتیں اس سے اس امکان کو سلب نہیں کرسکتیں۔

یہ خود (یعنی دعا) انسان کے باقی رہنے اور انسانیت کے باقی رہنے میں بڑی کارگر ہے۔ خاص طور پر اس عہد کے لئے کہ جس میں یہ

دونوں نابودی اور فراموشی کے خطرے سے دوچار ہوں۔ علاوہ ازیں یہ ابلاغ پیام، وسیلہ بیان فکر، پرورش احساس، تمناؤں اور آرزوؤں کی دائمی برقراری، اعلان مطالبات، انسان کی محاذ آرائی، جنگجویانہ روح کی حیات، سماج سے وابستگی کے عزم، فکری اتصال، آئیڈیالوجیکی تولّی و تبرّیٰ، اعتقادی آگاہیوں کی گہرائی اور رشد و نمو اور اپنی عظیم ذمہ داری کو پورا کرنے میں روح و فکر کی آمادگی کے لئے بھی بڑی موثر ہے اور وہ بھی اس دور میں کہ جب ساری قوتوں نے ان کی نابودی کے لئے ایکا کرلیا ہو۔ انشاء اللہ اگر کوئی اور موقع ہاتھ آیا تو میں صحیفے سے اپنی کاوشوں کو جنہیں میں نے ایک علمی میتھڈ سے استنباط کیا ہے اپنے سننے والوں کی خدمت میں عرض کروں گا۔

یہاں اس کم وقت میں، میں ایک ایسے خاص نکتے کی طرف آپ کی توجہ مبذول کروں گا جسے میں کہے بغیر نہیں رہ سکتا اور یہ ایک لطیف اشارہ ہے اس اعجاز روح، اس عجیب و غریب اور الہام و زیبائی بھری دنیا کی طرف کہ جو دعا کی سرزمین ہے اور جسے ہم امام سجاد علیہ السلام کی شخصیت اور ان کے صحیفہ دعا میں دیکھ سکتے ہیں۔

یہ بات آپ کے پیش نظر ہے کہ امام سجاد علیہ السلام کی زندگی ایک خصوصی سرگزشت کی حامل ہے، ائمہ اثنا عشری سب کے سب ظلمِ تاریخ کا شکار ہوئے، ان میں سے ہر ایک نے مظلومیت اور دکھ

درد کی زندگی گزاری اور نظام جور و غضب اور تاریخ کی گھٹن میں داد خواہی' آزادی اور انسانی فضیلت کی سرنوشت کو ایک رمزی اور عینی تجسم دیا' لیکن ان میں چوتھے امام ایک خاص زندگی کے حامل ہیں' وہ کربلا میں ایک نوجوان تھے کہ جنہوں نے اپنی آنکھوں سے ان ہولناک منظر کو دیکھا۔ ان کے لئے دشوار تر بات یہ تھی کہ انہوں نے اپنے عزیزوں اور مجاہدوں کی شہادت دیکھی اور خود شہادت سے محروم رہے' خود میدان جہاد اور کشتزار مرگ میں موجود تھے اور بچ رہے اور اس سے بھی دشوار تر "اس ساکت شدہ صحرا کو چھوڑنا تھا جس کے ہر گوشہ میں شہادت کے گلاب بکھرے پڑے تھے" جس کی رگوں میں محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم و فاطمہؑ و علیؑ و حسنینؑ کا لہو دوڑ رہا ہو اس کے لئے شہیدوں کی صف سے سلامتی کے ساتھ نکلنا کہ جو ہر تیغ کے زخم سے زیادہ کاری ہے اور اس حیات سے وابستہ رہنا کہ جس کے سامنے ہر موت' نجات و عنایت ہے اور شہادت کے بعد زندہ رہنے کے عمل میں ہولناک اور دردانگیز سرنوشت کی سمت جانا اور اس سے بھی دشوار تر "ان غمزدہ بچوں اور عورتوں کے درمیان تنہا رہ جانا جن کے ورثاء نے جام شہادت نوش کیا اور اسیروں کے اس کاروان کے ساتھ کہ جس کی کارواں سالار جناب زینب تھیں ---اور جنہوں نے اس تحریک کی رہبری کو اسیری میں' کربلا کے

انقلاب کے تسلسل کو ہولناک تنہائی میں' اور شہیدوں کے ابلاغ کے پیغام کو دنیا میں عام کرنے کی ذمہ داری سنبھال لی تھی--- "راہی پائیتخت مجرم ہونا" اور اس سے دشوار تر "زنجیر میں بندھے ہوئے قافلے کے پیش پیش پلید لوگوں کے درمیان سے گزرنا اور دغابازوں' نوکرمابوں' جلادوں' چاپلوسوں' دین فروشوں' عوام فریبوں' پاگل بھیڑیوں (استبداد گروں)' مکار لومڑیوں (استحمار گروں)' سکہ پرست چوہوں (استشہار گروں)' بدبخت لوگوں' جہل کی بھینٹ چڑھنے والے بھیڑوں (ذلت کے آگے سر جھکانے والوں)' پیٹ کے ذلیل غلاموں اور بدصورتی' حقارت' پستی اور پلیدی کے مجسموں کی تکلیف دہ غلیظ اور چبھتی نگاہوں کو اپنے جسم و جان پر محسوس کرنا۔" اور اس سے زیادہ دشوار "بدگہر جلاد کے دربار میں حقارت سے لایا جانا' اور...... پھر شمشر کے زیر سایہ تنہا اور دردانگیز زندگی شروع کرنا' ساری چیزوں کی بربادی کا ناظر ہونا اور اسلامی انقلاب کے ثمرات کی بربادی' ان کے نسخ' ان کی نفی اور اس کے غصب کو بے بسی سے دیکھنا' اپنے خاندان کے دکھ درد کا ہر روز مشاہدہ کرنا' حجاج کے ہاتھوں کعبے کی سنگباری کے المیے اور رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے مدینے میں' بسر بن ارطاۃ کے ہولناک قتل عام کو کہ جس میں اس نے تین دن تک مدینہ کی عورتوں اور لڑکیوں کی کہ جن کا تعلق اصحاب کے خاندان سے

تھا' اپنے سپاہیوں پر حلال کیا اور مسلمان عورتوں کو کنیزوں کی طرح بردہ فروشوں کے بازاروں میں فروخت کیا' (۱)

دیکھنا اور تحمل کرنا اور اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پیغام کو خون آشام جاہلیت کے اقتدار کی توجیہ میں آلہ کار بنتے دیکھنا۔ اکابرین اسلام کو اقتدار اعلیٰ کی خدمت میں یا اپنے آپ میں مست یا پھر زہد و رہبانیت و عبادت و ریاضت و علم کے آبرومندانہ شرمناک گوشہ امن میں ---کہ جو سب کے سب اس وقت نامرد (یعنی بے غیرت اور کم ہمت) لوگوں کی جھوٹی عصمت و عفت کے نقاب تھے--- دیکھنا' اور حقیقت کے دفاع میں اور دادخواہی' حریت طلبی' اور سچے اسلام سے وفاداری کی صف میں کسی کو نہ پانا اور اپنے آپ کو کہ جو وارث رسالت پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تھے' ان کے خاندان کے واحد کفیل تھے اور ہدایت و آگہی کے امانتدار تھے' زور و تزویر کے

۱- حالت یہ تھی کہ برسہا برس تک مدینہ کے لوگ ---یعنی انصار اور (پہلی یا دوسری نسل کے) بعض مہاجر--- شادی کے موقع پر اپنی لڑکی کی دوشیزگی کی ضمانت نہیں دیتے تھے! یہ واقعہ حرہ ہے کہ جس میں یزید نے مدینہ کے ان لوگوں سے انتقام لیا کہ جو براہ راست جناب رسالت کے دست پر شفقت کے پروردہ تھے اور اس کے سامنے گردن نہیں جھکاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ان دنوں جناب سجادؑ شہر میں نہیں تھے اور بروایتی "ینبع" گئے ہوئے تھے جہاں جناب امیر علیہ السلام کی ایک کھیتی تھی۔

مقابل مقاومت کی دیوار تھے اور حریم ایمان و انقلاب اور لوگوں کے پامال شدہ حقوق کے محافظ تھے' بالکل اکیلا محسوس کرنا اور اس تلخ اور جانگداز خونی دن کی یادوں کو کہ جو کوہ اندوہ و انبوہ بن کران کے وجود میں اتر گئے تھے۔ ہمیشہ محسوس کرنا اور اپنے ساتھ زندہ رکھنا اور ایک ایسی فضا میں جو فولاد کے برادے سے پر تھی ایک ایسی سرزمین پر کہ جو خون اور المیے سے پوشیدہ تھی ایک ایسی فضا میں کہ جو دھونس' دھمکی اور انتہائی سخت گھٹن سے بوجھل تھی ایک ایسے آسمان کے نیچے کہ جس سے وحشت برستی تھی اور ایک ایسے معاشرے میں کہ جس میں عاشورہ کے قتل عام کے بعد سیاہ خاموشی اور سرخ امن و امان نے خوف اور تقیہ سے سب کی گردن مروڑ دی تھی اور سب کو گھٹیا' مصلحت اندیشی کے تنگ و تاریک غار میں دھکیل دیا تھا اور کسی کو یہ ہمت نہیں تھی کہ وہ "خودپرستی" کے گریبان سے "خودچرانی" کے کھور سے اور اپنے گھر کے بند روزن سے گردن اٹھا کر باہر دیکھے کہ وہاں کیا ہورہا ہے اور قوم پر کیا گذر رہی ہے' زندہ رہنا' ایک ایسی روح' ایک ایسے ماضی کے ساتھ' ایک ایسی کیفیت کے ساتھ اور ایک ایسے احساس و مسئولیت کے ساتھ عاشورہ کے بعد کے منحوس اور ہولناک برسوں کو گزارتی ہے' ان برسوں کو کہ جس کا ہر لحہ ایک المیہ کا بوجھ اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ کربلا کے قتل عام اور مقاومت کے

آخری اڈے کی تباہی کے بعد والے برسوں میں، ان برسوں کہ میں جب فضا گھٹن سے معمور تھی، مجاہدوں کے خاندان سے بچ رہنے والے اسلامی انقلاب کے آخری سپاہی نے عدالت و رہبری سے اپنی وفاداری کا ثبوت دیا۔ ان خاموش اور ہولناک تسلیم کے حامل برسوں میں جب کوئی دم نہیں مار سکتا تھا، وقت نے ہر فریادی کا گلا گھونٹ دیا تھا، ہر حرف بند لبوں کے پیچھے پا بہ زنجیر تھا اور دمشق سے خراسان تک صرف جھوٹ اور تلوار کی حکومت تھی اور بس، امام سجاد علیہ السلام اس عظیم خون و جرم و ہراس بھرے امپراطور میں بالکل تنہا رہ گئے تھے۔ حتیٰ کہ انہیں اس بات کا یارا نہیں تھا کہ وہ اپنے دکھ پر آنسو بہائیں اور یہ حق بھی حاصل نہیں تھا کہ لوگوں کی سرنوشت پر فریاد کریں۔

دور دور تک پھیلی ہوئی کذب و فریب کی خلافت کے سارے منبروں پر خلافت کی زبان بول رہی تھی، مشرق و مغرب کی وسعتوں میں پھیلے ہوئے اسلامی مینار، سامری کے سنہرے بچھڑے کا حلقوم تھے۔ زاہد حضرات اور محافل حدیث مسخ و جعل سازی کے منابع تھے...... قرآن، پرچم شرک۔ مسجد مرکز ضرار و ذلت و فریب۔ جماعت کی نمازیں، عوام کا لانعام کی پرورش کرنے والی طاقت سے وابستہ انسانوں پر مبنی گوسفندوں کا تجمع! سارے محراب، علیؑ اور علیؑ نما

لوگوں کی قتل گاہیں اور علیؑ کو دشنام اور خلیفہ کو دعا دینے والے نمازیوں کی قبلہ گاہیں تھیں۔ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا گھر متروک، حقیقت کی زبان گنگ، ساری چیزیں پامالی اور نابودی کا شکار اور موت کی سی خاموشی میں تمام یادیں اور تمام یادگاریں خاموش اور فراموشی کی سمت جا رہی تھیں۔

اور امام سجاد علیہ السلام، ایک تنہا، اکیلی ہستی، ایک مجروح اور رنج و غم سے لبریز روح، "اپنے وطن میں اجنبی" مگر ہر چیز کے شاہد، ہر چیز سے آگاہ، صاحب نظر اور مسئول۔ "امام!" ہاں "امام!" کل کے انسان کو اس طرح کے حالات، اس طرح کے دور اور اس طرح کے ضعف و شکست و غربت میں ایک "نمونہ عمل" اور ایک "فکری معلم" کی ضرورت ہے۔ کل کی تاریخ میں اگر ایک "آگاہ و مسئول انسان" اپنے پیچھے گھاؤ، خون اور شکست کی داستان چھوڑے اور تنہائی اور عجز مطلق کی دردناک ترین تقدیر کا شکار ہو، اسے جرائم پیشہ مطلق العنان حکومت کا سامنا ہو، وہ لوگوں کو تلوار و فریب کے آگے سر تسلیم خم کیا ہوا اور اپنے آپ کو ایک تنہا اجنبی دیکھے، اس کی روح درد و غم سے لبریز اور دل زخموں سے چور ہو، ماضی سارا شکست کی تاریخ بن گیا ہو اور حال پر ایک خاموشی کا سناٹا چھایا ہوا ہو، اس کے ہاتھ خالی، زبان بریدہ، ہونٹ سلے ہوئے، پیر مفلوج اور گردن وحشی جلادوں کی گرفت

میں ہو' تو پھر بھی وہ مسئول ہے۔ اس لئے کہ مسئولیت توانائی سے نہیں آگاہی اور انسان ہونے سے ابھرتی ہے اور ایسے تنہا انسان کو اس ظلمت عام' قدرت مطلق اور فکر و آگہی کے قبرستان میں بھی کام کرنا پڑتا ہے' کیسے؟ اور کس طرح؟ امام چاہتے ہیں کہ ان حالات میں جب کچھ نہیں کیا جاسکتا' ان حالات میں کہ صحیح طرح سے موت کو بھی انتخاب نہیں کیا جاسکتا ایک شہید کی طرح اسلحہ کو بھی عنوان نہیں بنایا جاسکتا اس لئے کہ شہادت کے لئے بھی ایک ہموار سطح اور سازوسامان کی ضرورت ہے تاکہ شہید اپنے خون سے جمود کو توڑ سکے اور اپنی سرخ موت سے زمانے کے جلاد کی کھوپڑی پر ضرب الاجل لگائے وگرنہ وہ موت بے فائدہ اور مجہول و مسکوت ہوگی جس سے صرف دشمن فائدہ اٹھائے گا۔

امام سجاد علیہ السلام کی زندگی' ان کی حیات' ان کی سرنوشت اور ان کی خاموشی اور تکلم' ایسے انسان اور ایسے زمانے کے لئے ایک "امام" ہے۔ ان سوالوں کا مثبت جواب ہے کہ : کیا ایک تنہا انسان' دنیا پر مسلط ایک جلاد صفت شہنشاہیت کے مقابل پھر بھی مسئول اور ذمہ دار ہے؟ کیا ایک ایسی گہری خاموشی میں کہ جس میں دم مارنا بھی محال ہے حق کی آواز بلند کی جاسکتی ہے؟ کس طرح ممکن ہے کہ ایک اکیلا انسان ایسے موقع پر اپنی آرزوؤں' اپنی چاہتوں'

اپنے اقدار اور عقائد و عواطف کے بارے میں گفتگو کرے کہ جب ساری تلواریں ---وہ تلواریں کہ جو شرق و غرب عالم میں بڑے بڑے امپراطوروں کو خاک و خون میں نہلاتی ہیں--- ان جملوں کے مقابل اللہ کی نسبت دشنام سے زیادہ خشمگین' زیادہ بیدار اور زیادہ بے رحم ہوں؟

صحیفہ سجادیہ' تنہائی میں جہاد' اور چھائی ہوئی خاموشی میں ابلاغ اور عرض مدعا کی کتاب ہے' شکست میں مورچہ سنبھالنا ہے' گھٹن میں فریاد کی آواز بلند کرنا ہے' سلے ہوئے ہونٹوں سے سبق دینا ہے' غیر مسلح کئے جانے والے کا اسلحہ سنبھالنا ہے...... اور ان سب باتوں کے باوجود "دعا کی کتاب" ہے!

الکسس کارل نے کہا کہ دعا "تجلی عشق" اور "فقر" سے عبارت ہے' لیکن اسلام میں اس میں ایک اور شے "آگاہی" کو بھی بڑھادیا۔ تاہم امام سجاد علیہ السلام کے مکتب میں ایک چوتھے بعد نے اس میں جگہ لی۔ اور وہ زیر فرمان بنائے جانے والے حق پرستوں' ذمہ داری کا بوجھ سنبھالنے والے دادخواہوں اور ان مجاہد خود آگاہوں کا "معاشرے کی نسبت خصوصی ذمہ داری کا عمل" اور اس سے ان کی "وابستگی" ہے کہ جن کے پاس اپنی باتوں اور اپنے نظریہ کو بیان کرنے' حقیقت کی حفاظت کرنے اور باطل سے ٹکر لینے کا کوئی امکان نہیں

ہے اور جن سے ان کی فکری اور سماجی ذمہ داری کو پورا کرنے کے ہر وسیلہ کو چھین لیا گیا ہے اور یہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ شیعہ' دعا تک میں معاشرتی یا سماجی ذمہ داری کا حامل ہے نہ یہ کہ اس کی معاشرتی ذمہ داری صرف دعا میں ہے! اس رو سے ہم ایک جملے میں کہہ سکتے ہیں : دعا۔ امام سجاد علیہ السلام کے مکتب میں اس خصوصیت کے ساتھ کہ وہ ان کے لئے اور ہر اس شخص کے لئے کہ جو مکتب امامت میں درس زندگی' انداز "پیروی" اور جینے' سوچنے اور کام کرنے کے طریقوں کو سیکھتا ہے' عمیق ترین "آگاہیوں" سراسر وجود پر چھا جانے والی شور انگیز والہانہ چاہتوں اور بلند ترین تمناؤں کی آماجگاہ ہے' سلے ہوئے ہونٹوں کے پیچھے بات کرنے اور نیز باتوں کو کہنے کے لئے ایک زبان بھی ہے۔

اس جگہ کے لئے میں نے صحیفہ سجادیہ سے بعض نمونوں کا انتخاب کیا تھا تاکہ میں امام سجاد علیہ السلام کی دعاؤں کے چار بنیادی بعدوں کو حاضرین کی خدمت میں پیش کروں۔ لیکن اب وقت میں گنجائش نہیں ہے اور میں جناب استاد مطہری صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے تقریر میں اپنے حصے کا وقت دیا اور ابھی ابھی ارشاد فرمایا کہ میں اپنی بحث کو مکمل کروں اور وقت کو نہ دیکھوں۔ میں ان کے اس اظہار محبت سے غلط فائدہ اٹھانا نہیں چاہتا اور صحیفہ کے متن

کے تجزیہ اور تحلیل کو کسی اور وقت کے لئے رکھ چھوڑتا ہوں۔ شاید کوئی اور شخص مجھ سے بہتر انداز میں حق سخن ادا کرے۔ یہاں میں صرف ایک عظیم ہستی کے انوکھے اور انتہائی لطیف انداز کی گفتگو اور معنی و مطلب کے اعتبار سے اس خوبصورت و خوشنما کتاب کے اس نکتہ کو پیش کرنا چاہوں گا کہ جسے پیش نہ کرنا میرے لئے باعث افسوس ہوگا اور جس نے برسوں سے مجھے اس طرح مضطرب کر رکھا ہے کہ میں اسے بیان کئے بغیر نہیں رہ سکتا اور حیف ہے کہ آپ جیسے اس مکتب کے وارفتگان اور اس والا مرتب خاندان کی عظیم المرتبت ہستیوں کے شیفتگان نے اسے نہ سنا ہو۔

جیسا کہ گفتگو کے ضمن میں' میں نے اشارہ کیا تھا کہ ۱۳۳۸ ہجری میں جب میں اپنی تعلیم مکمل کرنے فرانس گیا تو جس دن میں نے فرانس میں قدم رکھا' اسی دن الکسس کارل کی "دعا" نامی کتاب کی تلاش میں باہر نکلا۔ ایران میں مجھے اس کے طرز فکر سے واقفیت ہوگئی تھی۔ میں اس کی دو کتابوں "انسان ایک سمجھ میں نہ آنے والی ہستی" اور "زندگی کے طور طریقے" کے ترجموں کو ایران میں پڑھ چکا تھا اور دعا سے متعلق کتاب کو بھی میرے صاحب فکر و نظر دوست جناب مہندس کاظم زادہ صاحب نے مجھے متعارف کرایا تھا۔

پہلا کام جو میں نے فرانس میں کیا وہ اس مختصر مگر انتہائی

خوبصورت اور عمیق کتاب کا ترجمہ تھا۔ ان ہی دنوں میں مجھے خیال آیا کہ میں اسلامی اور خاص طور پر شیعی دعاؤں کے مستند متون پر تحقیق کروں۔ میں نے اس کام کے لئے ایک مختصر مگر جامع طریق کار تیار کیا جو اسی کتاب کے ترجمے کے اختتام پر آپ کو ملے گا اور نیز شیعی دعاؤں کے تجزیہ اور تحلیل کے لئے ایک میتھڈ بھی نکالا۔ ان شیعی پیشواؤں اور ان کے پیروکاروں نے ان خاص تاریخی حالات کی بنیاد پر جن میں ان کے ہونٹ ہمیشہ سلے رہے اور قلم و بیان و تنقید و تبلیغ کی آزادی یہاں تک کہ اپنے عقائد کے اظہار تک کی آزادی ان سے سلب کرلی گئی، دعا پر تکیہ کیا ہے۔ انہوں نے حق و عدالت کی نسبت اپنی فکری اور روحی کیفیت اور والہانہ چاہت کو اپنی شکست، اپنے رنج و الم، اپنی شہادت اور اپنے خون سے بھری سرگزشت کو۔ آیندہ پر اپنے پختہ ایمان کو، اور اہل ظلم اور حکومت جور کے خلاف اپنی انقلابی محاذ آرائی کو اپنی دعاؤں میں سمودیا ہے۔ ان کی دعاؤں کے متن درد و احساس و شوق و عمق و رمزو کنایہ حتیٰ کہ کچل دینے والی خاص انداز کے شدید سیاسی حملوں سے سرشار ہیں۔

اسی لئے میں نے اس کام کے لئے صحیفہ کو منتخب کیا کہ جو صحیح بنیادوں پر استوار شیعی دعاؤں کا ایک مستند ترین اور کامل ترین نمونہ ہے۔ میں نے اس سے بہت سے نکتے اور بہت سی نئی باتوں کا استنباط

کیا ہے اور مجھے امید ہے کہ ایک دن وہ تکمیل کی منزل میں پہنچے گی اور مجھے ایسا موقع ملے گا کہ میں اسے خصوصی طور پر پیش کروں۔

لیکن جو نکتہ میں یہاں بیان کرنا چاہتا ہوں وہ اس راہ و روش سے مختلف ہے جسے میں نے اس سلسلے میں تحقیق کے لئے انتخاب کیا ہے اور یہ وہ نکتہ ہے کہ جو امام چہارم علیہ السلام کی روح لطیف و زیبا کی خصوصیتوں میں ایک خصوصیت کو اجاگر کرتا ہے۔

جیسا کہ میں پہلے اشارہ کرچکا ہوں' امام علیہ السلام کی دشوار زندگی غم انگیز سرگزشت اور اتنی ساری مصیبتوں' دکھوں اور تنہائی و ستم جھیلنے کی کیفیت نے آپ کی روح کو' آپ کی عمر پُر درد سلسلے میں کچل دیا۔ شیعہ ائمہ میں آپ کی دشوار زندگی ایک استثنائی حیثیت کی حامل ہے۔ اندیشے' احساس' بیان اور رفتار و سلوک کی اذیت ناکی' مصائب روزگار پر صبر' خونی حادثوں کی نسبت تحمل' غصہ پینے' نیز مثبت ریاضتوں' سخت مقاومتوں' دشمن دوست کی بدنیتیوں اور بالا خر سخت تنہائیوں' عشق و درد سے پُر خلوتوں' فہم کی ہزاروں حیرت انگیز رسائیوں' نظر نہ آنے والے غیبی چشموں کی جوشش اور بیان سے باہر بلکہ بیشتر اوقات فہم و احساس سے بالاتر اتصالوں نے ان کو روحانی حالات' حس کی گرفت میں آنے والی لطافتوں اور ماورائی نورانی شعاعوں کی جلوہ گاہ بنا کر انہیں ممتاز کردیا تھا۔

یہ درست ہے کہ شیعہ ائمہ "سب کے سب واحد نور سے ہیں" اور سبھی ایک مکتب کے پروردہ' ایک راہ کے راہی اور ایک مقصد کو لے کر آگے بڑھنے والے ہیں' لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ طرز عمل اور نوعیت میں ایک جیسے ہیں اور ہر ایک' عمل میں دوسرے کا تکراری ہے۔

جب سلسلہ امامت کی پہلی کڑی اور اس مکتب کے ممتاز ترین اور اکمل ترین مظہر امام علی علیہ السلام خود' اپنے ان دونوں عظیم المرتبت فرزندوں کے بارے میں کہ جو دونوں امام ہیں تصریح کرتے ہیں کہ : "میں نے اپنے حلم کو (امام) حسنؑ اور اپنی شہادت کو (امام) حسینؑ میں بانٹ دیا ہے" تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ائمہ علیہم السلام باوجود یہ کہ سب کے سب ایک حقیقت واحدہ ہیں اور ان میں کا ہر ایک دوسرے کی راہ اور دوسرے کے کام کو آگے بڑھانے والا ہے' تاہم ہر کوئی نوعیت یا کیریکٹر یعنی رفتار و حالات میں انفرادی خصوصیتوں کے اعتبار سے ایسی خصوصیت کا حامل رہا ہے کہ جو دوسروں میں بھی رہی ہے مگر کسی میں اس صفت کا غلبہ زیادہ رہا ہے جو اسے دوسروں سے ممتاز بناتا ہے اور یہی صورت انبیاء علیہم السلام کی بھی ہے' اور اتفاقاً" یہ مختلف خصوصیات ایک عمیق حکمت کے حامل ہیں۔ اس لئے کہ شیعی ائمہ میں سے ہر ایک باوجود یہ کہ راہ

و مکتب و ہدف میں مشترک ہیں وقت کے حساب سے اور معاشرتی، سیاسی اور ثقافتی تبدیلیوں کے اعتبار سے ضروری تھا کہ وہ اپنے واحد مقصد، پیغام رسانی کی صورت اور ڈھب کو مختلف اور متفاوت انداز میں تعین کریں اور یہی وجہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی مزاجی کیفیت اس کردار کے ساتھ جسے ان کو خلق خدا کی امامت اور جہادِ مسلسل میں ادا کرنا ہے سازگار رہی ہے (۱)

اور یہ فطری بات ہے کہ ---زین العابدین کا لقب پانے والے--- امام سجاد علیہ السلام کی روح و احساس کو بھی تنہائی، رنج و الم اور عبادت میں، لطیف ترین احساسات کی تجلیگاہ اور رقیق ترین روحی کیفیت کا حامل ہونا چاہئے اور یہ خصوصیات ان کی رفتار و گفتار میں بھی پائی جانی چاہئے۔

لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ آپ کی عادت تھی کہ آپ ہر سال موسم حج سے پہلے مدینہ سے ---جہاں کے لوگ آپ کو جانتے اور آپ کا احترام کرتے تھے--- باہر نکلتے تھے اور دور و دراز سے آنے

۱- تاریخی حقیقت سے صرف نظر کہ جو ان خصوصیتوں کی آئینہ دار ہے ہم اپنی دعاؤں اور زیارتوں میں بھی اس بات کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ انبیاء اور شیعہ ائمہ میں سے ہر ہستی ایک خاص نمایاں صفت سے پکاری جارتی ہے۔ زیارت وارث اس کی مثال ہے۔

والے حج کے قافلوں کے راستے میں بیٹھ جاتے تھے اور اپنے آپ کو ظاہر کئے بغیر ایک عام خدمت گار کے طور پر کسی کاروان میں شامل ہو جاتے تھے اور اس طرح حاجیوں کے قافلے کے ساتھ مکہ پہنچتے تھے اور اپنی محنت اور ملنے والی اجرت سے اپنا خرچ چلاتے اور حج کو اختتام پر پہنچاتے تھے اور یہ سب کچھ وہ اس لئے کرتے تھے تاکہ وہ حج کی اس روح کو کہ جو اپنی "خودی" کو کچلنے' عوام الناس کے ساتھ حقیقی برابری کے احساس' سب کے ساتھ یکجہتی اور تمام امتیازات اور خاندانی' طبقاتی اور مشغلہ سے متعلق خصوصیات وغیرہ کی نفی سے عبارت ہے پائیں اور اس کی حقیقت کو اپنے پورے وجود کے ساتھ عملاً" محسوس کریں۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ان ہی عام رائج حاجیوں میں سے کہ جو حج کو بھی ایک اضافی امتیاز کے حصول اور دوسروں پر برتری کے عنوان سے انجام دیتے ہیں اور خود قافلہ میں بھی اور حج کی بجا آوری کے دوران بھی سب پر سے یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ وہ حاجی اور سب سے ہٹ کر ایک محترم شخصیت ہیں' ایک حاجی نے امام علیہ السلام کی نسبت گستاخی کی اور اپنے حکم کی انجام دہی کے بارے میں آپ کو بڑی شدت سے برا بھلا کہا' آپ کی توہین و تحقیر کی' اور ایک جنجال بپا کیا اور بات جھڑکی اور گھڑکی تک پہنچی۔ امام علیہ السلام نے نرمی اور تحمل سے کام لیا' فروتنی دکھائی اور اس کے حکم کی

بجا آوری کے لئے واپس پلٹے۔ اس اثناء میں ایک شخص جس نے پہلی مرتبہ آپ کو غور سے دیکھا تھا اور اس واقعے کے سبب آپ پر توجہ دی تھی اچانک آپ کو پہچان گیا اور اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور لوگوں کو حقیقت حال سے واقفیت ہوئی۔ لوگوں نے آپ کو گھیرلیا اور پھر معافی تلافی' اظہار شرمندگی اور بعد ازاں تجلیل و تقدیس کا سلسلہ چلا ...... اس کے بعد وہ پھر آہستہ سے بتائے بغیر اپنے آپ کو مریدوں کی تکلیف دہ تجلیل و تکریم اور پر تکلف خاطر تواضعات کے شکنجے سے چھڑا کر پھر کسی اور دور دراز سے آنے والے قافلے کے راستے میں کھڑے ہوگئے تاکہ پہچان میں آئے بغیر خدمت گزار کے عنوان سے اپنے آپ کو اس میں شامل کریں اور اس طرح وہ حج کو کہ جو ان کے خاندان کی ریت ہے اور جسے وہ ہر کسی سے زیادہ سمجھتے ہیں' درک بھی کریں اور اس کو جس کو کہ خداوند عالم نے امانت کا بلند درجہ عنایت کیا ہے تاکہ اس کی زندگی خلق خدا کی خدمت اور امت کے قافلے کی رہبری میں گزرے' اسی صورت سے اس راہ میں اپنے دست و بازو سے ان لوگوں کی حتیٰ المقدور مدد بھی کریں کہ جنہوں نے خدا کے گھر کا عزم کیا ہوا ہے! لیکن صحیفہ کے باطن سے میں نے جن باتوں کو لیا ہے ان کا تعلق ان جملوں سے ہے کہ جنہیں امام علیہ السلام نے خداوند عالم سے کسی چیز کے طلب کے سلسلے میں ادا کیا ہے اور وہ

درخواستیں بھی ہیں جو دعا کی صورت میں خدا کے حضور پیش کی گئی ہیں!

اس کام کے لئے میرا اسلوب کار یہ ہے :

(میں ۔ ہم ۔ اور ان سب) کی ضمیر---مانگنے کی نوعیت--- مانگنے کا لحن اور مانگنے کی تمہید و طرح۔ اس طرح میں نے ---خاص الخاص مفہوم میں امام علیہ السلام کی ہر دعا کی ان چند خصوصیتوں کو ان کالموں میں نوٹ کیا ہے اور یہ وہ دعائیں ہیں جنہیں آپ نے خدا سے ایک یا ایک سے زیادہ لوگوں کے لئے کچھ طلب کیا ہے۔

اولا"۔ یہ ایک کھلی بات ہے کہ جو چیز طلب کی جاتی ہے وہ یا خود دعا کرنے والے کے اپنے لئے ہوتی ہے کہ جس میں وہ واحد متکلم ضمیر "میں" کو لاتا ہے یا وہ کسی جماعت کے لئے ہوتی ہے جس میں دعا کرنے والا خود بھی شامل ہوتا ہے اور یہاں ضمیر متکلم مع الغیر "ہم" کو کام میں لایا جاتا ہے یا پھر وہ اس گروہ کے لئے ہوتی ہے جس میں دعا کرنے والا نہیں آتا یا وہ واقعا" ان ہی میں کا ایک ہوتا ہے مگر خود کو اس میں شمار نہیں کرتا اور اس طرح چاہتا ہے کہ اس کی ساری طلب دوسروں کے لئے ہو اور خود براہ راست اسی میں شامل نہ ہو۔

ثانیا"! وہ تمہید یا وہ سر آغاز جو دعا سے قبل پیش کی جاتی ہے' اس میں بیشتر گفتگو اور بیشتر تکیہ خدا کی ان خاص صفتوں پر ہوتا ہے جو

دعا کے موضوع سے ہم آہنگ ہوتی ہیں۔ مثلاً اگر وسعت رزق' بھوک سے نجات اور تنگی معیشت کے لئے مادی نعمتوں کا مطالبہ ہو تو خدا کی رزاقیت اور کرامت پر تکیہ ہوتا ہے اور خدا کو ان صفات سے پکارا جاتا ہے اور اگر موضوعِ طلب گناہوں کی بخشائش یا مصیبتوں سے چھٹکارا ہو تو رحمانیت' رحیمیت اور غفران و عفو موضوع گفتگو ہوتا ہے.......

پھر اس شخص کے بارے میں بھی جس کے لئے دعا ہو رہی ہو ---خواہ وہ آپ دعا کرنے والا ہو یا اس کا گروہ یا اس کے ساتھ چند آدمی یا پوری جماعت--- یہی صورت کارفرما ہے اور یہاں بھی خدا کی توصیف ان صفات سے ہوگی کہ جو موضوع طلب سے موافقت رکھتی ہوں۔ ممکن ہے ہمارے طلب کی فہرست طویل ہو مگر کلی طور پر یہ تین حصوں میں تقسیم ہوتی ہیں۔

ایک گناہوں سے توبہ کی گفتگو ہے۔ اس کیفیت میں اس فرد کی تمہید جس کے لئے دعا ہو رہی ہو' ایک عاجز' آلودہ اور گناہوں سے سرتاپا غرق شخص کے عنوان سے ہوگی کہ جو عدل الہی کی بنیاد پر نجات کا استحقاق نہیں رکھتا لیکن خدا سے چاہا جاتا ہے کہ وہ اس کی بیچارگی پر رحم کرے' اپنے احسان سے اسے بخش دے' اس کیفر سے اسے نجات دے جس کا وہ مستحق ہے اور اس کے ضعف و ذلت پر رحم د

کرم کرے۔

دوسری : امید و آرزو ہے جس میں خدا کی مدد' اس کی ہدایت اور اس کی توجہ و عنایت شامل ہے.........

تیسری : بطور مطلق اس دنیا کے لئے خیر و رحمت و لطف و یاری و عزت و ثروت و کامیابی و نعمت و قوت و سلامت و عافیت کی طلب اور اس دنیا کے لئے الہٰی نوازشوں' محبتوں اور مہربانیوں میں ڈوبے رہنے کی گفتگو ہے۔

اور عجیب بات یہ ہے کہ جب کبھی ایک ایسے عاجز' آلودۂ گناہ اور اسیرِ ہوا و ہوس' بندے کی گفتگو ہوئی ہے کہ جو بخشش کی دعا کرتا ہے' رحم کی درخواست کرتا ہے' اپنی ناقابلیت کا اعتراف کرتا ہے' روتا ہے' گڑگڑاتا ہے اور اللہ کے دریای رحمت و غفران سے اس سزا کی نسبت نجات کا خواہاں ہوتا ہے جس کا وہ مستحق ہے اور چاہتا ہے کہ اس کا وبال اسپر نہ آئے اور خدا اس سے درگزر فرمائے' وہاں زیادہ تر "میں" کی ضمیر کو کام میں لایا گیا ہے۔ یعنی فقط اپنی ذات کے بارے میں گفتگو کی ہے۔

اور جب گفتگو اس کی ہدایت' اس کی توجہ اور اس کی عنایت کی ضرورت' اس کے سبب پر چھائے ہوئے کرم کی آرزومندی اور توقع کی ہوتی ہے تو "ہم" استعمال میں آتا ہے اور وہ ان کو سب کے لئے

چاہتے ہیں اور اپنے آپ کو بھی اس صف میں جگہ دیتے ہیں۔

اور تیسری حالت میں صرف "ان سب" کی ضمیر آئی ہے، یعنی مسلمان بندے پاکیزہ افراد، مجاہدین، سرحد کے محافظین...... قوم و ملت اور بزرگ لوگ...... اس منزل پر جہاں وہ مطلق طور پر خیرو برکت اور عزت و کامیابی کے خواہاں ہوتے ہیں، ان سب کو دوسرے کے لئے طلب کرتے ہیں، عوام الناس کے لئے چاہتے ہیں اور خود کو اس میں شامل نہیں کرتے۔ اس میں وہ صرف ایک دعا کرنے والے کا کردار ادا کرتے ہیں کہ جو لوگوں کی نسبت اپنے فریضے کے عنوان سے اور ان کی فضیلتوں اور خدمتوں کے صلے میں ان کے لئے دعا کرتے ہیں اور خود کو ان آرزوؤں اور ان چاہتوں کے قابل نہیں سمجھتے!

دعا کی اعجاز آفرینی اور اہمیت کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے اور بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔

الکسس کارل کہتا ہے :

"جہاں عشق کے قدم پڑتے ہیں عقل پیچھے رہ جاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دعا پرواز عشق میں عقل کی سیاہ رات سے تعبیر کی بلند ترین چوٹی کو ڈھونڈ نکالتی ہے۔"

اور نیز :

"تاریخ میں کوئی قوم سقوط و زوال سے دوچار نہیں ہوئی ہے، مگر یہ کہ اس نے از قبل' دعا سے دستبردار ہو کر خود کو موت کے لئے آمادہ کیا ہے۔"

اور نیز :

"ایسا لگتا ہے کہ دعا' اگر اپنی پوری شرائط کے ساتھ انجام پذیر ہو اور اس کے ساتھ شدت' مداومت اور اخلاص بھی ہو تو چاہنے والا جو کچھ چاہے گا حاصل کرے گا اور جس دروازے پر دستک دے گا کھل جائے گا۔"

اور نیز :

"دعا" مانگنے والے کی روح اور اس کی فطرت پر اپنے عمیق ترین اثرات کو مرتب کرتا ہے اور اس میں ایسی بالیدگی پیدا کرتا ہے کہ ماحول اور وراثت کا لباس اس پر تنگی کرنے لگتا ہے۔"

"لارڈ" کی طبی انجمن' ہر سال ان بیمار زائرین کی فہرست چھاپتی ہے کہ جن کو طب نے جواب دے دیا تھا اور انہوں نے "لارڈ" میں

آکر دعا کی معجزہ آفرینی سے صحت پائی ہے۔

ہمارے درمیان بھی دعا کے صحت بخش اثرات کے بارے میں گفتگو عام رہی ہے اور بہت کم ایسے گھرانے ملیں گے کہ جن میں دعا کا رواج نہ ہو اور انہوں نے اس واضح و آشکار حقیقت کو بار بار کے تجربے سے نہ گزارا ہو کہ جس پر سارے اقوام عالم کا یکسان اور مشترکہ طور پر عقیدہ ہے۔

میں خود باوجود اس کے کہ دعا کے حیرت انگیز اثرات کا شدت سے معترف ہوں اور جیسا کہ آپ ملاحظہ فرمارہے ہیں کہ میں کس سنجیدگی سے اس پر سوچتا ہوں۔ مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میری توفیق آپ سب سے کمتر ہے اور اس کے نتیجے میں اس کے آثار سے میری محرومیت سب سے زیادہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں نے اپنی اندرونی زندگی میں اس کی معجزنما طاقت کا مشاہدہ کیا ہے اور یہی وہ معجزہ ہے کہ جس کے بارے میں' میں نے "کویر" (کے باب معبد) میں گفتگو کی ہے اور کہا ہے : اگر "تقدیر" نے کام نہیں دکھایا تو تدبیر بھی کچھ نہیں کرسکتی' "طلب" ---اگر اپنے وجود کے ساتھ سارے اعضاء اور روح کی ساری قوتوں کی ایک مرکز پر جمع آوری کی ساتھ' اور نیز اس قوت کے ساتھ جو "صمیمیت" میں ہے' تجلی کرے' اگر ہم اپنی ساری ہستی کو ایک "طلب" میں سمودیں اور ایک "خواہشِ

مطلق" ہوجائیں اور اگر ہم یقین و امید و ایمان سے سرشار ہوکر صادقانہ حملوں اور یورشوں کے ساتھ "طلب" کریں تو اپنا جواب پالیں گے۔"

طاقتور ایمان "وجود" بخشتا ہے۔ ہر بند دروازے کی چابی تو ہمارے پاس نہیں ہے اور نہ ہی وہ کسی مہارت، کسی فراست، کسی ذکاوت اور کسی تدبیر سے کھلنے والا ہے۔ یہ تو بس "طلب" کے تند و تیز حملوں سے اس وقت جب کہ وہ عشق و یقین و اخلاص کے اعجاز آفریں طاقت سے ایک آمرانہ یورش کی کیفیت میں ہو، ٹوٹ سکتا ہے۔

"اور جب عشق فرمان صادر کرتا ہے تو "محال" سر تسلیم خم کرلیتا ہے۔ (۱)

اور نیز :

میں عرض کرچکا ہوں کہ دعا، تجلی فقر و عشق ہے اور یہ وہ حالات ہیں کہ جن میں دعا کرنے والا اس فرصت کو پاتا ہے کہ وہ مسلسل روزمرہ کی اس زندگی میں کہ جو آدمی کو اپنی حقارتوں اور پستیوں میں کھینچ لیتی ہے، اپنی روح کو بلند و برتر چاہتوں اور ماورائی وارفتگیوں کی جلوہ گاہ بنائے اور انسان کی بلندترین خواہشات اور حالات و تمایلات کو کہ جو مادی زندگی میں سرکوب اور غفلت کا

۱- "کویر" باب معبد- صفحہ ۲۰۶

شکار رہیں بیدار ہونے، سر اٹھانے اور خدا کے سامنے ظاہر ہونے کا موقع دے اور اس طرح ہر چند دن میں ایک بار اپنی نسبی، حقیر اور عام رائجہ سرگرمیوں اور مصروفیتوں کو ایک طرف رکھ کر اس آستانے میں آئے کہ جو آزاد، جاوید، بلند و بالا، ابدی اور ماورائی ہے اور طلب کی بلند، عاشقانہ اور پر خلوص طاقت کے ذریعے نردبان وجود سے ایک سیڑھی اوپر آئے اور آدمی کے صعود یا بلندی کی منزل کا تجربہ کرے۔

اور نیز :

میں نے عرض کی کہ "فقر و عشق" کے علاوہ اسلامی دعا "حکمت" کا درس بھی دیتی ہے اور احساس و احتیاج کے علاوہ خرد کو بھی خوراک فراہم کرتی ہے اور آگاہی، جہاں بینی اور شعور و شناخت بہم پہنچاتی ہے۔

اور شیعی دعا، چوتھے بعد "جہاد" کی بھی حامل ہے اور اپنے دور کے فرض شناس انسانوں، لوگوں کی قسمت کے محافظوں اور ظلم و غصب و ناروا ترجیحات، اور استبداد دشمن شیعہ افراد کا --- کہ جن کا ایمان، رہبری اور داد خواہی کی بنیادی پر ہے --- اسلحہ جنگ اور ان کی حق گوئی کی زبان بھی ہے۔ شیعی دعائیں، انسانی صفات، سماجی خواہشات اور جماعتوں کی ذمہ داریوں کو کہ جن سے دعا کرنے والا

وابستہ ہے' اور زمانے کا جبر اور سلسلہ خلافت کے نظام ہائے جور انہیں کچلنے اور فراموشی کے غار میں دھکیلنے کے درپے ہیں۔ ہمیشہ تازہ' زندہ اور پرجوش رکھتی ہیں اور بار بار شب و روز' ہر ہفتہ' ہر مہینے اور ہمہ وقت کانوں میں بولتی اور دلوں میں یاد دلاتی رہتی ہیں اور بہترین صورت اور عمیق ترین اور پرجوش ترین جذبات کے ساتھ دعا کرنے والی جماعت پر چھا جاتی ہے۔

بہرصورت'

جب میں صحیفہ پر تحقیق کے ضمن میں اس نکتہ پر پہنچا جسے میں نے امام سجاد علیہ السلام کی دعاؤں کے بارے میں آپ کے سامنے پیش کیا اور باوجود اس کے کہ ظاہرا" یہ صرف ایک بہت لطیف اخلاقی نکتہ دکھائی دیتا ہے میں نے اس پر جتنی زیادہ اپنی فکر دوڑائی میری حیرت میں اضافہ ہوتا گیا کہ "عبادت گزاروں کی یہ زیباترین روح" سرکش نہیں' سربرخاک پیشوا۔ جبار نہیں' سجاد امام۔ آقاؤں' خاقانوں' سرداروں اور خداوندوں کی زینت نہیں' بندگی کرنے والے عابدوں کی زیب و زین........! کہاں تک خدا کی خُلق و خُو رکھتی ہے! اور کہاں تک زیبائی روح اور لطافت احساس میں بلندی کو چھو رہی ہے اور اخلاص' ایثار' محبت' کرامت' شرافت' فروتنی' باریک بینی' نیکی اور ضمیر و وجدان کی لطافت میں کس درجہ تک پہنچتی ہے!

میں اپنے جی میں سوچ رہا تھا کہ انہوں نے خدا کے حضور اپنی دعاؤں میں، اپنی پرجوش اور پرازدرد خلوت میں، اس کے حضور اپنے شوق عشق میں بلاشک اور بلاشبہ جیسا کہ میں نے ان کی دعاؤں اور ان کی گفتگو کے تجزیئے، تخلیل اور جانچ پڑتال سے حاصل کیا، پہلے سے تیارشدہ کسی مواد کو پیش نہیں کیا۔ پہلے سے اپنا ذہن نہیں بنایا۔ ان کی فطرت نے بغیر کسی ارادے کے اس طرح کی لطافت روح، انسانی دوستانہ اور شرافت مندانہ اعلیٰ ظرفی اور بلندپایہ ادب کو ازخود ابھارا ہے۔ انہوں نے نیکی نہیں کی، نیکی ان کا وجود بن گئی ہے۔ انسان دوستی، ایثار، خلق خدا کے لئے سعادت و بھلائی کی جستجو، لوگوں کے لئے ہدایت و نجات کی آرزو اور دوسروں کی تقدیر سازی کی فکر میں ہونا اور اپنے آپ کو بھلا دینا نفی کردینا اب ان کا فریضہ نہیں ان کی صفت ہے، میں کیا کہہ رہا ہوں؟ ان کا وجود ہے!

یہ صورت میرے ذہن میں تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر ان تمام باتوں کو جو دعا کے لئے کہی گئی ہیں اور کہی جارہی ہیں ہیچ سمجھ لیا جائے تو ایسی صورت حال میں جب کہ ہر چیز تشدد کا راستہ اختیار کررہی ہے اور اس زندگی میں جس میں تمدن، علم، صنعت، فلسفہ، اخلاق، یہاں تک کہ فن اور ادب بھی بڑی تیزی سے متمدن انسانوں کی وحشیانہ راہ اختیار کررہی ہے اور ایک ایسے نظام میں کہ جس میں

اس کے سوا چارہ نہیں کہ انسان یا ایک تیز سینگ والا گینڈا بن جائے! یا پھر "مسخ" ہو جائے! نیز اس صورت حال میں کہ جس میں ہر شے سیر تاریخ میں نفس پرستی، مصلحت اندیشی، منفعت طلبی اور ہر چیز کو اپنے لئے چاہنے کی سمت جا رہی ہے۔ لوگ اپنی لذت پرستی، منفعت طلبی اور مصلحت اندیشی کے خول میں رینگ رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے درمیان فاصلے بڑھتے جا رہے ہیں۔ ہر شخص اپنی فردیت کی قید میں مقید ہو رہا ہے جس کے نتیجے میں قساوت، تشدد، بے رحمی، خود غرضی، سانحے، نفاق، فریب، جنگ، سردی، خشکی اور ضمیر و وجدان و خلوص و صمیمت کی موت میں اضافہ اور ایثار علی النفس یا جاں نثاری، خیر خواہی، درگزشت، بلند انسانی تقویٰ اور دوسروں کے لئے جینے اور دوسروں کے لئے مرنے کا مزہ بنی نوع انسان کے ذائقہ میں مفقود ہوتا جا رہا ہے، اگر دعا کا معجزہ صرف یہ ہو کہ وہ روح کو ایسے ذائقہ سے ہمکنار کرے، ایسی لطافت و زیبائی بخشے، ضمیر کو فردیت کی سرحدوں سے آگے لے جائے اور دل کو ایسی بلندی دے کہ اس میں سارے انسانوں کی سچی چاہت کے لئے گنجائش ہو...... تو کیا یہ کم ہے۔

اب اسے ایک جملے میں سمیٹ کر عرض کروں کہ اگر سوائے ان جملوں کے کہ جنھوں نے صحیفے کی تشکیل کی، کوئی زبان دعا کی اہمیت کے لئے نہیں کھلتی اور اس کے آثار سوائے اس روح کے اور کہیں نہیں

ملتے جس نے کہ صحیفے کے جملوں کی صورت گری کی تو کافی تھا کہ ہر انسان، آگاہی اور دعا کو نوع بشر کی روح اور اس کے ضمیر کے تکامل و زیبائی کا ایک طاقتور ترین عامل سمجھے اور اسے انسانی معاشرے کی معنوی تربیت میں اعجاز گری کا مقام دے اور ایک ایسا درس سمجھے کہ جو ایک وحشی اور سنگدل انسان کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا ایک مہذب اور نرم دل انسان کے لئے ۔

اس انسان کے لئے کہ جو "عشق" کے مفہوم کو بھی سمجھتا ہے۔

اور اشک کی زیبائی کو بھی

جو لڑتا بھی ہے

اور یہ بھی جانتا ہے کہ "اس کے" مہربان اور مشفق زانو پر سر رکھنا اور اس کے نوازش بھرے ہاتھوں کے نیچے ---کہ جو دو خاموش مسیح ہیں--- لذت تسلیم میں رام ہونا، آدمی کی شان کو نہیں گھٹاتا۔

☆ ☆ ☆

پڑھنے والوں سے کچھ باتیں

کانفرنس کے اختتام پر میرا ارادہ تھا کہ دعا کے فلسفے کو' خاص طور پر شیعی دعا کے سماجی کردار کو اس کی تاریخی محاذ آرائی اور دائمی داد خواہانہ جہاد کے پس منظر میں پیش کرنے کے بعد میں صحیفہ سجادیہ سے چند ایک مثالوں کو سامنے لا کر اس بنیاد پر اس کا تجزیہ کروں' مگر وقت کی کمی کے سبب ایسا نہ ہو سکا۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا' فرانس میں پروفیسر کارل کی دعا کی کتاب کے ترجمے کے موقع پر اس میتھڈ کے ساتھ جس کی طرف اشارہ کر چکا ہوں میں نے چاہا کہ اسلامی دعاؤں کے بلند و بالا متون پر تحقیق کروں اور اس سلسلے میں' میں نے قدم بھی آگے بڑھایا اور کتاب کے ترجمہ کے آخر میں اس کے تشکیل دھندہ عناصر کو مختصر اور کچی صورت میں پیش بھی کیا' لیکن اس کی تکمیل کا مجھے موقع نہیں ملا۔ (۱)

۱- ہرچند کہ اسلامی علوم کے عظیم اسکالر جناب بازرگان صاحب نے اپنی باریک بینی' دقیقہ سنجی اور ترقی پسندانہ نگاہ سے ---خاص کر اسلامی نقطہ نظر سے اور بیشتر ابتدائی متون پر تکیہ کرتے ہوئے--- بڑے گہرے جائزے اور ممکنہ سرعت کے ساتھ دعا کے

میرا ایک اور لائحہ عمل یہ تھا کہ میں اسلامی دعاؤں اور خاص کر شیعی دعاؤں کو بہ ایں سبب کہ شیعی ثقافت اس سلسلے میں بہت شاداب ہے--- عیسائی' زرتشتی' ویداتی' یہودی اور بدھستی وغیرہ جیسی دعاؤں کے متون سے موازنہ کروں مگر یہ بھی رہ گیا۔

اگر ہمارے معاشرے کے فرض شناس' بیدار مغز محققین' فاضل دوستوں اور ہم خیال ساتھیوں کی طرف سے منعقدہ یہ کانفرنس ان کاموں کے آغاز کرنے یا جاری رکھنے کے لئے جو میری آرزو میں دبی رہ گئی ہے ایک ایسی دعوت بن سکے کہ جو باعث تشویق ہو تو میری ناکام حسرتوں کو تسکین مل سکتی ہے اور شاید یہ کام اور تحقیق کا یہ عمل دعا کو ہمارے نام نہاد ترقی پسند افراد کی نظروں میں تہمت سے پاک اور دعا کے ایک جاندار مروجہ' عام طریقہ کار کو ان کے سامنے آراستہ کرسکے

بارے میں اپنی تحقیقات کو تکمیل کی منزل تک پہنچایا ہے اور خوش نصیبی سے ان کا یہ کام ایک طباعتی ادارہ نے نئے انداز سے کارل کی دعا کے ترجمے کے ساتھ یکجا چھاپا ہے اور بڑی حد تک کمی کو پورا کیا ہے جو کارل کی دعا کی کتاب میں مسلمان پڑھنے والے مفکروں کو محسوس ہو رہی تھیں' مگر اس کے باوجود ابھی یہ کام مکمل نہیں ہوا ہے اور آگے کی بہت سی منزلیں باقی ہیں اور ہماری آنکھیں اس راہ پر لگی ہوئی ہیں جس پر بقول حضرت عیسیٰ علیہ السلام "چلنے والے بہت کم ہیں" اور جس کی ضرورت بہت زیادہ ہے۔

اور نیز دعا کی نسبت ہمارے معاشرے کی اس منفی اور پست سوچ کی تبدیلی میں معاون ہوسکے کہ جو ہماری روگرانی' بے حسی' غفلت' فرائض سے پہلوتہی' جھوٹے حواس' عمل و آگاہی سے بے رخی اور دعا کے ترقی پسندانہ کردار کی نسبت آج کے معاشرے اور مزاج میں غلط تصورات کا باعث بنی ہوئی ہے اور صحیح مفہوم کو غلط رنگ دے رہی ہے۔ اگر ہم اس بات کو سمجھتے اور مانتے ہیں کہ اس وقت موجودہ افکار میں دعا زیادہ تر منفی اثرات کی حامل ہے تو پھر ایک طاقتور جذبے' ایک ترقی پسندانہ کردار اور "اسلامی دعا" کے محرک کو جگانے کی راہ میں' اور خاص طور سے اس کردار کے منطقی تحقیق و تجزیئے' ان متون کے تعارف' انحرافی عناصر کی تشخیص اور ان دعاؤں کے متون میں داخل ہونے کے لئے اقدام کہ جو ایک ایسے شیعی معاشرے اور افکار کو منازل کمال تک پہنچانے والی ہے کہ جو دعا سے سوچتے ہیں' دعا سے سیکھتے ہیں' دعا سے بولتے ہیں اور حد یہ ہے کہ دعا کے ذریعے جنگ لڑتے ہیں ایک مفید کوشش ہوگی اور ان سچے ترقی پسند لوگوں کی سماجی فریضے کی ادائیگی کا منہ بولتا ثبوت ہوگی کہ جو لوگوں کی بیداری کے لئے سوچتے ہیں اور سستی' کاہلی' ذہنی انحراف اور انسانی اور سماجی فرائض کی نسبت سلب مسئولیت سے نفرت کرتے ہیں۔

اس رسالے کے اختتام پر میں اس دعا کے متن کو پیش کررہا

ہوں کہ جو "فقرو عشق" کی ایک صورت ---یا بالفاظ دیگر--- خود میرے "راز و نیاز" میری آرزوؤں' میرے دکھوں اور میری درخواستوں سے عبارت ہے۔

شاید اس موقع پر کہنے والے کہیں کہ : اس سے لوگوں کا کیا واسطہ؟ لیکن یہاں میں نے اپنے گھر کے اخراجات کے ضامن' اپنی ارواح گزشتگان کے سخن طراز' اپنے قرضوں کے نالہ گر اور اپنی طلب داری میں آشفتہ دل کی حیثیت سے دعا نہیں کی ہے اور اپنے حقیر' حب و بغض کی زبان میں خدا کو نہیں پکارا ہے۔ یہ دعا' اندیشوں' آگاہیوں' دکھوں' دل کے پھپھولوں' ضمیر کے سرمایوں' آرزوؤں' امیدوں' دردوں' درخواستوں' قہروں' نفرتوں' تنہائیوں اور روح کی کرچیوں کی تجلی ہے۔ وہ روح کہ جو زمانے کے ستم کا شکار ہے' جو دشمن و دوست کی ٹھکرائی ہوئی ہے۔ جو ہمیشہ کے زر' زور اور تندویر کی گھناؤنی تثلیث کی قیدی ہے اور قاسطین و مارقین اور ناکثین کی ملعون مثلث کی اسیر ہے۔ نہ اس کا کوئی مورچہ ہے' نہ اسلحہ اور نہ سامان دفاع' بلکہ صحیح طور پر مرنا بھی اس کے نصیب میں نہیں ہے۔ لیکن اس کا رخ خدا کی طرف' اس کا دل سرمایہ دار عشق' اس کا وجود امید سے لبالب' اس کا سر ولولے سے پر' اس کے ہاتھ تمناؤں سے بھرے ہوئے' اس کے پیر راہ سفر میں' امانت بردوش اور مقصد' موت تک'

بے پیچ و خم بالکل راست ہے...... اور اب اپنی خلوت میں، درد و داغ کے قصوں، المیوں، تشنگیوں اور تمناؤں کے لئے دست بہ دعا ہے، ایک روح کی دعا، "میری" دعا۔

لیکن اس "میری" میں، میں نہیں میرا عہد اور میرا عصر ہے، میری دردمند اور غمزدہ نسل کی روح اور میرے معاشرے کی مسئول اور آگاہ ضمیر ہے....... اور اگر یہاں، کہیں تنہا میرے ایک فرد کی گفتگو ہو تو بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ میں نے دعا کے الفاظ اور انداز طلب میں اِس روح کو اُس "روح" سے آشنا کرنے کی کوشش کی ہے کہ جو "عابدوں کی زیبا ترین روح" اور دعا کی حیرت انگیز ترین جان ہے وہ کہ جس نے تاریخ کی ہولناکترین خاموشی میں معبد مناجات کو اپنا مقام معراج اور جہاد کے یلغار کا مورچہ بنایا!

یعنی سجادؑ

روایات میں ہے ---اور کارل نے بھی بعینہ یہی کہا ہے--- کہ دعا کی گفتگو کا انداز ایسا ہونا چاہئے جیسے بچہ اپنے باپ سے گفتگو کررہا ہو۔ دعا جس قدر ہٹیلی اور ایک قرض خواہ کی طرح اڑیل ہوگی استجابت سے قریب تر ہوگی۔

دعاؤں کے اس متن کا آدھا حصہ وہ ہے جسے میں نے تین سال پہلے اپنے لئے لکھا تھا اور میرے درد میں رہتا تھا اور دوسرا نصف

---نصف دوم--- وہی ہے جسے میں نے اس دن (کانفرنس میں) اپنی گفتگو کے اختتام پر پیش کیا۔ یہاں میں نے ان دونوں حصوں کو ایک جگہ اکٹھا کردیا ہے تاکہ خود ایک مستقل نوشتہ ہوجائے' ایک خاص انداز کی دعا ہوجائے' مجھ جیسے انسانوں کی دعا' اس زمانے اور اس زمین کی نسل کی دعا جس میں اس کی آرزوئیں' اس کی تمنائیں' اس کی محرومیاں اور ضرورتیں سبھی کچھ ہیں۔ دعا اپنے ہم معنی لفظ میں "نیایش" ہے جو "نیاز" (یعنی حاجت) سے نکلا ہے۔ پس اس مفہوم کے پیش نظر کیا اسلام اور خاص کر تشیع میں نیایش یا دعا ایک طرح کی گفتگو یا باتوں کو پیش کرنا نہیں ہے؟

اور کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ کوئی اپنی زبان میں دعا کرے؟ اور اگر ہوسکتا ہے تو پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اسے تحریر میں لائے۔

ہر کوئی خدا سے گفتگو کرسکتا ہے۔ اپنی چاہتوں اور اپنی حاجتوں کو اپنی زبان میں اس کے حضور پیش کرسکتا ہے' ہر حاجت' ہر زبان میں پیش ہوسکتی ہے لہٰذا اب ہم دعا کے دونوں حصوں کو آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں!

میرے عزیز دوستو! ہم ایک انتہائی خراب دور سے گزر رہے ہیں۔ میری تمام امیدیں اور تمام آرزوئیں' تمام آزاد اندیش اور بیدار مغز نوجوانوں سے وابستہ ہیں۔

بہرحال وہ لوگ کہ جو مقام و منزلت کے حامل ہیں، جن کے پاس علم ہے جو معاشرے میں صاحب حیثیت ہیں، جن کے پاس دولت بھی ہے اور منصب بھی ان کی ذمہ داری اس سے زیادہ نہیں ہے کہ وہ "اپنی توانگری کی حفاظت" کریں۔ مگر آپ لوگ کہ جن کے پاس ابھی "محرومیت کی نعمت" ہے شاید ان چیزوں کے لئے جو ہاتھ سے جا رہی ہیں جو آہستہ آہستہ فراموش ہو رہی ہیں کچھ کر سکیں۔

☆ ☆

دعا

خدایا : میرے "عقیدہ" کو میری "باطنی عداوت" سے محفوظ فرما۔

خدایا : مجھے "مخالف" کے عقیدہ کو برداشت کرنے کی طاقت عنایت فرما۔

خدایا : عقلی اور علمی بالیدگی مجھے "تعصب" (حمایت)' "احساس" اور "اشراق" (روشنی) سے دور نہ کرے۔

خدایا : مجھے ہمیشہ بیدار و ہوشیار رکھ تاکہ کسی شخص یا کسی فکر---کے مثبت یا منفی ہونے---کی "صحیح" اور "مکمل" شناخت سے پہلے کوئی فیصلہ نہ کروں۔

خدایا : میری خودغرضی اور حسد پر مبنی جہل کو مفت میں دوست پر حملے کے لئے دشمن کا آلہ کار نہ بنا۔

خدایا : میری اس انا کی شہرت کو جس میں کہ "میں رہنا چاہتا ہوں' اس انا پر قربان نہ کر جس میں کہ "دوسرے مجھے رکھنا چاہتے ہیں۔"

خدایا : میری روح میں "انسانیت" کی نسبت فرق کو "فکر" میں اختلاف اور "رابطہ" میں اختلاف سے نہ ملا کہ میں ان

تین علیحدہ اقنوم کے درمیان تمیز نہ کرسکوں۔

خدایا : مجھے حسد' کینے اور غرض کے سبب اہل ظلم کی ہوا و ہوس کا مہرہ نہ بنا۔

خدایا : میرے اندر خودغرضی کو اس طرح مار دے یا اس طرح دور کردے کہ میں دوسروں کی خودغرضی کو محسوس نہ کروں اور اس سے دکھ نہ اٹھاؤں۔

خدایا : مجھے ایمان میں "اطاعت مطلق" بخش تاکہ میں اس دنیا میں "عصیان مطلق" رہوں۔

خدایا : مجھے "تقویٰ ستیز" سے آشنا کر تاکہ میرے قدم انبوہ فرائض میں نہ ڈگیں اور "تقویٰ پرہیز" سے امان میں رکھ تاکہ میں خلوتِ عزلت میں' عضو معطل نہ بنوں۔

خدایا : مجھے راحت و آرام اور خوش نصیبی کی پستی میں نہ اتار بلکہ اونچی سطح کے اضطراب' بلند پایہ غم اور عظیم حیرانیوں کو میری روح میں سمودے۔ لذتوں کو اپنے حقیر بندوں' اور پسندیدہ دردوں کو میرے وجود میں اتار دے۔

خدایا : میرے افکار و احساس کو اتنی نیچی سطح پر نہ لا کہ میں خود حقیر چالاکیوں اور "گھٹیا آدم نما لوگوں" کی پلید و خوار

پستیوں کی طرف توجہ دوں اس لئے کہ میں "گھٹیا فریب زن" سے زیادہ "بڑھیا فریب خوردگی" کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔

خدایا : مجھے انسان کے ان چار بڑے زندان : "طبیعت۔" "تاریخ۔" معاشرے" اور "منت" سے رہا فرما تاکہ جس طرح تو نے اے پروردگار میری تخلیق کی' میں خود اپنا خالق بن جاؤں' نہ کہ ---جانوروں کی طرح--- اپنے آپ کو ماحول سے منطبق کروں بلکہ ماحول کو اپنے آپ سے تطبیق دوں۔

خدایا : "شک" کے مقدس آگ کو میرے وجود میں اس طرح روشن کر کہ وہ سارے "یقین" جل جائیں جنہوں نے میرے اندر گھر کرلیا ہے اور پھراس راکھ کے ڈھیر کے اوٹ سے صبح یقین اپنے ہونٹوں پر ایک آفتابی مسکراہٹ لئے' ہر غبار سے پاک' طلوع کرے۔

خدایا : مجھے ترجمہ کی ناداری اور تقلید کی بے چارگی سے نجات دے تاکہ میں موروثی سانچوں کو توڑ سکوں' مغرب کی "قالب سازی" کے سامنے کھڑا ہوسکوں' میرے ہونٹ بولتے رہیں اور کوئی اِدھر اُدھر کی نہ ہانکے۔

خدایا : قناعت اور صبر و تحمل کو میری قوم سے لے اور مجھے عنایت فرما۔

خدایا : اس مصلحت کوش، مواخذہ گر، باریک بیں قوت ادراک کو --- کہ جو میرے "ہست" سے ہجرت، اور ابدی ہونے کی معراج پر مبنی دو شہ پروں کی راہ میں بے شمار رکاوٹیں کھڑی کر رہا ہے۔ اس شوق و اشتیاق کے بے قرار شعلوں پر مشتمل کارواں کے پیروں تلے کچل دے جو میرے اندر بڑی تیزی سے گزر رہا ہے ---

خدایا : تو مجھے علی علیہ السلام جیسی پرشکوہ روحوں اور --- گلیگمش سے سارتر، لوئی سے عین القضاۃ، اور مہرادہ سے زراس تک کے --- تمام صدیوں کے پسندیدہ اور ہر دلعزیز دلوں کی پناہ میں، پست ارواح کی ذلت بھری دوستی اور دشمنی سے پاک فرما۔

خدایا : میں، حسین بن علی علیہ السلام کے فرزند اکبر کی طرح تجھ سے عجز و التجا کرتا ہوں کہ تو میرے دشمنوں کو احمقوں میں سے منتخب فرما اس لئے کہ چند نادان و ناسمجھ دشمن ایک ایسی نعمت ہیں کہ جسے خداوند عالم اپنے خاص

دوستوں کو عطا کرتا ہے۔

خدایا : تو' ہرگز مجھے بے شعوروں کی مراد اور بے تمیزوں کا محبوب نہ بنا۔

خدایا : میرے ارادے' میرے علم' میرے استحکام' میری بے نیازی' میری حیرت' میری لطافت روح اور شہادت و تنہائی کو تقویت پہنچا۔

خدایا : میری دستگیری فرما تاکہ میں اپنے معاشرے کو کتاب' ترازو اور لوہے کے تین پایوں پر استوار اور اپنے دل کو حقیقت' زیبائی اور نیکی کے تین سرچشموں سے سیراب کروں۔

خدایا : اس مقدس کلام کو جسے تو نے "روسو" کے دل میں ڈالی ہرگز میرے حافظے سے محو نہ فرما کہ :

"میں تیرا اور تیرے عقائد کا دشمن ہوں' لیکن اس بات کے لئے تیار رہوں کہ اپنی جان کو تیری آزادی اور تیرے عقائد کے لئے قربان کروں!"

خدایا : میرے معاشرے کو تصوف اور معنویت پرستی کی بیماری سے نجات دے تاکہ وہ زندگی اور واقعیت کی طرف

لوٹ آئے اور مجھے زندگی کی بے قدری اور واقعیت پرستی کی بیماری سے نجات دے تاکہ میں عرفانی آزادی اور معنوی کمال تک پہنچوں۔

خدایا : ان روشن خیال لوگوں کو کہ جو اقتصاد کو "اصل" سمجھتے ہیں روشن کردے کہ اقتصاد "ہدف" نہیں، اور ان مذہبی لوگوں کو کہ جو "کمال" کو ہدف سمجھتے ہیں واضح کردے کہ اقتصاد بھی "اصل" ہے۔

خدایا : اس آیت کو جسے تو نے "داستان یوسکی" کی زبان پر دوڑایا، روشن خیال لوگوں کے دلوں میں اتار کہ :
"اگر خدا نہیں تو ہر چیز مجاز ہے۔"
یہ دنیا بے معنی، یہ زندگی بے مقصد اور انسان ہیچ ہے،
اور ایک عبث اور بے معنی انسان، ذمہ داریوں سے بھی عاری ہے۔

خدایا : مجھے ہر اس چیز کے "نہ ہونے" اور "نہ چاہنے" کی خواہش میں لوہا لاٹ کردے کہ جو ہر انسانیت کو تباہی سے ہمکنار کرنے والی ہے۔

خدایا : اپنی پوری عمر میں مجھے ایک لمحہ کے لئے بھی ایسی

پستی میں مبتلا نہ کر کہ میرا واسطہ ایسے لوگوں سے پڑ جائے کہ جنھوں نے اپنی عمر میں لمحہ بھر کے لئے بھی "خوش نصیبی"، "سکون" اور "لذت" پر "عظمت"، "دکھ" اور "سختی" کی ترجیح میں ذرہ برابر تردید کی ہو۔

خدایا : جس کو تو دوست رکھتا ہے اسے تقلین فرما کہ :
عشق، لذت حیات سے بہتر ہے،
اور جس کو سب سے زیادہ چاہتا ہے اسے اس لذت سے آشنا کر کہ :
ربط دوستی، عشق سے برتر ہے۔

خدایا : تو مجھے شکست میں ہمت، ناامیدی میں صبر، بلا مصاحب کوچ، بلا اسلحہ جہاد، بلا صلے کام، بے چرچے جاں نثاری، بے دنیا دین، بے عوام مذہب، بے نام عظمت، بے نان خدمت، بے ریا ایمان، بے نمود خوبی، بے خامی گستاخی، بے غرور عالی طبعی، بے ہوس عشق، لوگوں کے ہجوم میں تنہائی اور دوست کی نظروں سے پوشیدہ رسم دوستی کی توفیق عنایت فرما۔

خدایا : تو مجھے ان فضائل سے محروم فرما جو کسی کے کام نہ آئے

اور اس لطیف علم و فضل کی وحشیانہ جہالت میں مبتلا نہ فرما
کہ جو بلند و بالا احساسات کو لئے رفعتوں کی معراج پر، کسی
غریب کی آنکھوں کی گہرائی میں بھوک کی چمک اور کسی مظلوم
کی پشت پر تازیانوں کے سیاہ نشانات کو نہ دیکھ سکے!

خدایا : ان بڑے پارساؤں کو کہ جنہوں نے ریاضت میں گوشہ نشینی اختیار کی ہے اور عبادت کی پاکیزہ عزلت یا پھر علم و ہنر میں نفس کشی پر کمر باندھ لی ہے جتنی جلد ہو سکے توفیق دے کہ وہ اللہ کی اس خوبصورت عالم طبیعت میں جہاں ---سوائے ان کے--- ہر موجود کا کوئی نہ کوئی مفہوم ہے عالم کی اس زندہ قامت میں جہاں ---سوائے ان طفیلیوں--- کے ہر ذرہ ایک خلیہ ہے، خلقت کے اس ھماھنگ اور منظم نظام میں جہاں مخلوق کا ---بجزان کھوکھلے پاکبازوں، یا پاکباز کھوکھلوں کے--- ایک کردار ہے، اپنی جگہ بنائیں تاکہ خلقت ہیچ و پوچ کے عالم سے مبرا ہو اور ظاہر بیں نگاہوں میں قدرت کی کاریگری پر کوئی حرف نہ آئے۔

خدایا : "سارتر" سے پوچھ کہ اگر اچھائی کے معیار کو بھی میں خود ---جیسا چاہتا ہوں--- بناتا ہوں تو پھر جس

"اچھائی کی نیت" کو وہ اخلاق کا معیار گردانتا ہے' کیا ہے؟

خدایا : مادہ پرستوں سے کہہ کہ انسان وہ درخت نہیں ہے جو فطرت' تاریخ اور سماج میں غیرارادی طور پر اگ آتا ہے۔

خدایا : مذہبی لوگوں کو بتا کہ :
انسان' مٹی سے بنا ہے'
بتا' کہ ایک مادی وجود بھی خدا کا وہی مفہوم رکھتا ہے جو ایک غیبی وجود رکھتا ہے۔
دنیا میں خدا کے وجود کا پیمانہ اتنا ہی ہے جتنا کہ آخرت میں'
اور یہ کہ مذہب' اگر موت سے پہلے کام میں نہ آیا تو موت کے بعد بھی کام نہیں دے گا۔

خدایا : کافر کون ہے؟ مسلمان کون؟ شیعہ کون ہے؟ سنی کون؟ کون کہاں تک درست ہے؟ کس کی سرحد کہاں تک سہی ہے؟
میری خواہش ہے کہ دنیا کی اس واحد شیعہ مملکت میں کوئی دن ایسا آئے کہ جب لوگوں کے شعور اور انکی مذہبی شناخت کی سطح اس حد تک پہنچے کہ وہ ہماری باضابطہ مذہبی

خطبہ جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کو اس طرح سمجھیں جس طرح کہ ---ایک عیسائی طبیب--- "سلیمان کتانی" نے پہنچوایا ہے۔ جناب علیؑ کو اس رخ سے دیکھیں جس رخ سے ---ایک مسیحی طبیب--- جورج جرداق نے تعریف کی ہے۔ اہلبیت علیہم السلام کو اس نگاہ سے دیکھیں جس نگاہ سے کیتھولک مذہب کے "مسینیون" نے تحقیق کی، ابوذر غفاری کو ان الفاظ سے تولیں جنہیں "جودۃ السحار" نے لکھا ہے حتیٰ کہ قرآن کو اس زبان میں سمجھیں جس میں کہ ---چرچ کے ایک پادری--- "بلاشر" نے ترجمہ کیا ہے اور ہمارے پیغمبر کو اس رخ سے دیکھیں جس رخ سے یہودی محقق "روڈنسن" نے دیکھا ہے اور ہماری یہ شیعہ قوم، یہ اہلبیت کے چاہنے والے، یہ "ولایت" کے باضابطہ تولائی، اور یہ مذہب حقہ جعفریہ کے مدعی حضرات، کوئی دن ان باضابطہ کافروں کے آثار کے تراجم کو پڑھنے کی توفیق پائیں۔

اور پھر یہ لوگ کہ جو آدم کے تنہا وارث، اعجاز انسانیت کے زندہ و جاوید مجسمے اور تاریخ کے سرخ پرچم کے حامل حسینؑ کو ایک عاجز و نالاں شخصیت دکھاتے ہیں کہ

جو موت کے لمحے میں اپنے بدخواہ اور بدنہاد قاتل سے عاجزی کے ساتھ پانی مانگتا ہے! یہ لوگ کہ جو علیؑ جیسے انسان کو کہ جو مظہر شرف انسان اور حریت و دلاوری کا دیوتا ہے، جس کی زبان حق گوئی میں اتنی ہی مشہور ہے جتنی کہ اس کی تلوار ناحق پر ضرب لگانے میں، ایک ایسا ست عنصر، کمزور دل، اور لرزاں شخصیت والا انسان بتاتے ہیں کہ جو اپنی جان کے خوف سے ظالم حکومت سے بیعت کرتا ہے، اپنی جان کے خوف سے غاصب کو جانشین پیغمبر گردانتا ہے، اپنی جان کے خوف سے "کذاب پیشوا" کی اقتداء کرتا ہے، اپنی جان کے خوف سے نامشروع و نادرست شوریٰ میں شمولیت اختیار کرتا ہے - اپنی جان کے خوف سے اپنی امامت کو کہ جو مقام نبوت کی طرح منصوص من اللہ ہے، رائے اور شوریٰ پر چھوڑتا ہے۔ دوسرے کو اس مقام پر باضابطہ طور پر تسلیم کرتا ہے جس کا تعین خدا کو کرنا ہے اور یہی نہیں بلکہ یہ مظہر جوانمردی، اور انسانی آزادی و عظمت کا سرخیل، اپنی جان کے خوف سے اس....... غاصب و .... کو اپنی بیٹی بھی عقد میں دیتا ہے کہ جو........ کا حامل بھی ہے اور جس نے غصب کی بنیاد قائم کی ہے جس کے

غلام نے اس کی (یعنی حضرت علیؑ کی) ذی عزت اور ذی وقار شریک حیات کو ایذا پہنچائی ہے۔ خود اس نے اس کے گھر کو آگ لگائی ہے' گھر کے دروازے کو جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کے پہلو پر گرایا ہے جس کی ضرب سے چھ ماہ کے محسنؑ کا اسقاط ہوا ہے......!

یہ لوگ کہ جو جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کو اس خاتون کو کہ جو جناب رسالت ماب کی تصریح کے مطابق "تاریخ بشر کی چار ممتاز عورتوں میں سے ہے۔" جو "عالم کی تمام عورتوں کی پیشوا ہے" وہ کہ جس کے ہاتھ کو رسول خدا از روئے احترام چومتے ہیں' جو علیؑ جیسے عظیم المرتبت ہستی کی ہمسرد ہمدل ہے' جو پیغمبر خدا کی بیٹی ہے' جس نے حسینؑ اور زینبؑ جیسی شیردل ہستیوں کو پالا ہے--- نالہ و فریاد کرنے والی ایک عاجز عورت دکھاتے ہیں جو صرف آہ و فریاد کرتی ہے' اپنے شکستہ پہلو کے درد میں روتی ہے اور زمین کے اس ٹکڑے کا شکوہ کرتی ہے کہ جسے حکومت جور نے ان سے چھین لیا تھا۔

یہ لوگ کہ جو جناب زینب سلام اللہ علیہا کو کہ جس نے موت کی سمت امام حسین علیہ السلام کی ہجرت کے موقع

پر اس وقت جب کہ آپ نے اپنے حیران کن انقلاب کا پختہ عزم کرلیا تھا' اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کی تاکہ راہ جہاد میں "قیدی بنائے جانے کے لئے" آزاد رہے' اس کو کبھی جب اس کے خاندان کا کوئی شہید پشت فرس سے زمین پر آتا تو ایک گھبرائے ہوئے عقاب کی طرح خیمہ سے باہر دوڑ پڑتی اور نوحہ کناں اس کے سرہانے بیٹھ جاتی اور درد و کرب سے رو رو کر اس کا مرثیہ پڑھتی' ---جب اس کے دو بچے جنہیں وہ اپنے ساتھ قتل گاہ میں لائی تھی فرش زمین پر گر پڑے تو سب کی نگاہیں جناب زینب سلام اللہ علیہا کے خیمے کی طرف اٹھیں لیکن اس بار خیمے کے پردہ کو کوئی جنبش نہ ہوئی حتیٰ کہ اس کے رخساروں پر ایک آنسو بھی ڈھلکتا نظر نہیں آیا۔ اس زینب کو جس کے بازوؤں میں بندھی ہوئی زنجیر' اس کی شیردلی کو متاثر نہیں کررہی تھی' جو اپنے بھرے خاندان کو لٹا کر قتل گاہ سے بڑی ہمت و حوصلہ سے وطن واپس آئی' جس کی' قاتلوں کے شہروں اور جلادوں کے محلوں کی فضا میں علیؑ جیسی دل دہلا دینے والی فریادیں اب بھی گوش تاریخ میں گونج رہی ہیں اور ستمگاروں کے پیروں تلے کی زمین ہلا رہی ہیں--- اپنے بھائی پر رونے والی

عورت دکھاتے ہیں' اور بس!

اور اسی طرح یہ لوگ کہ جنہوں نے علمدار کربلا کو ---کہ جس کی یاد سے قلب میں ایک تلاطم پیدا ہوتا ہے' جس کا چہرہ مروت و مردانگی کی تفسیر کرتا ہے--- عورتوں کی پارٹیوں کا کردار اور ابلہانہ دسترخوانوں کا سمبل بنا دیا ہے۔ (۱)

یہ لوگ شیعہ ہیں' علیؑ کے شیعہ' اہلبیت کے واحد پیروکار' وہ تنہا قوم کہ جس نے حق کی تشخیص کی ہے اور علیؑ کے پر شکوہ چہرے اور علیؑ کے خاندان کی عظمتوں کو پایا ہے؟

اور ڈاکٹر بنت الشاطی یونیورسٹی کا پروفیسر اور اعلیٰ درجہ کا اہل قلم جس کی ساری عمر اور قلم کا سارا زور اہلبیت کی مدحت و خدمت میں صرف ہوا ہے اور خود کے یہ الفاظ ہیں کہ : میں اس "گھر" میں زندگی بسر کر رہا ہوں' سنی ہے؟

اور "بلاشر" کہ جو عیسائی مذہب کا باضابطہ عالم تھا اور

۱۔ یہ ایران کی ان مضحکہ خیز رسومات اور خود ساختہ باتوں کی طرف اشارہ ہے جس میں اس عظیم المرتبت ہستی کو مقید کر دیا گیا ہے۔ (اردو ترجمہ)

جس نے قرآن کی تحقیق اور اس کے ترجمہ میں ۴۰ سال محنت کی اور اس میں اپنی آنکھوں کی بینائی کھودی' یا "مسینیون" کہ جو علم و دانش کا ایک سمندر تھا اور جس نے 'ایران میں شیعی تاریخ کے پہلے موسس "سلمانؓ" کی زندگی پر تحقیق میں اپنی عمر کے ۲۷ قیمتی سال صرف کئے اور جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی زندگی اور ان کی رحلت کے بعد قوموں کی تاریخ میں ان کی شخصیت کی تاثیر کی نسبت پوری عمر' تحقیق و تدقیق میں گزاری اور عربی' فارسی' ترکی' لاطینی حتیٰ کہ مغلیہ دور تک کے تمام تاریخی آثار و اسناد و ماخذ کو چھان کر اس میں موجود حقائق کو اکھٹا کیا اور جب کبھی جناب سیدہ سلام اللہ علیہا' اسلامی عرفان اور جناب سلمان پر گفتگو کی سرتاپا مشتعل ہوا' کافر؟

خدایا : مجھے بتا' تو خود کس نگاہ سے دیکھتا ہے؟ تیرا فیصلہ کیا ہے؟ کیا "ناموں" پر عشق کا غلبہ تشیع ہے؟

یا مسیموں کا عرفان؟

یا ---اس سے بھی بڑھ کر--- "رسوم" کی پیروی؟

خدایا : ایک ایسی زندگی عطا کر کہ موت کے لمحے میں' مجھے گزری ہوئی زندگی کے کسی بے ثمر لمحہ کا افسوس نہ ہو' اور

ایسی موت عطا کر کہ جس کی بے ہودگی پر مجھے کوئی دکھ نہ ہو۔
مجھے اجازت دے کہ میں خود اس کا انتخاب کروں، مگر اس طرح، جس طرح کہ تو پسند کرتا ہے۔

خدایا : "کس طرح جینے" کو تو مجھے سکھا،
"کس طرح مرنے" کو میں آپ سمجھ لوں گا۔

خدایا : مجھے "مصلحت پرستی" کے اس پلید المیہ سے ---کہ جس نے اس طرح عمومیت اختیار کی ہے کہ اب اس کی وقاحت مٹ گئی ہے اور یہ ایک ایسی بیماری ہوگئی ہے کہ جو اس سے بچ رہتا ہے بیمار ہو جاتا ہے--- محفوظ رکھ، تاکہ میں "مصلحت کے پیش نظر حقیقت کو قانونی رنگ میں ذبح نہ کروں۔"

خدایا : مجھے اس بات سے باز رکھ کہ :
اسلام کی نسبت میرا ایمان اور خاندان رسالت کی نسبت میرا عشق مجھے دین فروشوں، متعصب لوگوں اور رجعت پسندوں کے ساتھ ہم آواز کرے۔
اور میری آزادی لوگوں کی پسند کی مقید ہو جائے۔
"میرا دین" میرے "دینی وقار" کے پردے میں دفن ہو جائے، عوام پرستی مجھے میرے تقلید کرنے والوں کا مقلد

بنادے'

اور میں اس چیز کو جسے "حق سمجھتا ہوں" اس لئے چھپاؤں کہ وہ لوگوں میں بری سمجھی جاتی ہے۔"

خدایا : میں جانتا ہوں کہ تیرے پیامبر کا اسلام "نہیں" سے شروع ہوا' اور تیرے دوست کے تشیع کا آغاز بھی "نہیں" سے ہوا۔(۱) مجھے اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بھیجنے والے اور اے علیؑ کو دوست رکھنے والے' "ہاں والے اسلام" اور "ہاں والے تشیع" سے روگرداں فرما!

خدایا : شیعہ ہونے کی ذمہ داریوں کو ---کہ جو علیؑ کی طرح جینے' علیؑ کی طرح رہنے علیؑ کی طرح مرنے' علیؑ کی طرح عبادت کرنے' علیؑ کی طرح سوچنے' علیؑ کی طرح جہاد کرنے' علیؑ کی طرح کام کرنے' علیؑ کی طرح بولنے اور علیؑ کی طرح خاموش رہنے سے عبارت ہے--- علیؑ کے اس ناتواں

۱- وہ "نہیں" کہ جسے مظہر صفات حق علیؑ نے اس شوریٰ کے اندر عبدالرحمٰن کے جواب میں کہا جسے تاریخ کے دوسرے خلیفہ نے خلافت کے چناؤ کے لئے انعقاد کیا تھا۔

بندے کے حافظے میں تازہ کرتا رہ تاکہ علیؑ کی ہمہ جہت شخصیت، کردار سازی میں میری معاون رہے اور میں انہیں منبر پر خدائے سخن، محراب میں خدائے عبودیت، زمین میں خدائے عمل، میدان میں خدائے پیکار، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہلو میں خدائے وفا، معاشرے میں خدائے مسئولیت، نہج البلاغہ میں خدائے قلم، زندگی میں خدائے پارسائی، اسلام میں خدائے دانش، زمانے میں خدائے انقلاب، حکومت میں خدائے عدل، گھر میں خدائے پدری اور انسان پروری، اور ہمہ جا اور ہمہ وقت بندہ خدا کی حیثیت سے دیکھتا رہوں۔

اور ایک فرض شناس شیعہ کے اعتبار سے مکتب، وحدت اور عدالت کی نسبت کہ جو اس کی زندگی کے تین ابواب ہیں اور رہبری اور مساوات کی نسبت جو اس کا مذہب ہے، اور تمام مصلحتوں کو حقیقت پر نچھاور کرنے کی نسبت کہ جو اس کی رفتار ہے، وفادار رہوں۔

خدایا : "یہ لوگ" علیؑ کو خدا تک لے جاتے ہیں اور اس سطح تک نیچے لاتے ہیں جس میں وہ "خلاف شرع" رائے دیتے ہیں اور زور زبردستی سے خائن کی بیعت کرتے ہیں!

یہ لوگ حکومت جور کے تسبیح خواں اور "ولایت علیؑ کی نعمت" کے رجز خواں ہیں، لیکن "وہ لوگ" اب بھی اموی اور عباسی حکومتوں کے سلسلوں کی تبلیغاتی مشنری کی قید سے آزاد نہیں ہوئے ہیں۔

انقلاب، آزادی اور سوشلزم تک پہنچتے ہیں، لیکن ابھی تک علیؑ، حسینؑ اور ابوذر کو نہیں پہچانا ہے!

خدایا : مہربانی فرما کہ میرا ایمان، مجھے نام و نان فراہم نہ کرے۔ ایسی قوت دے کہ اپنی روٹی، حتیٰ کہ اپنے نام کو بھی ایمان کی حفاظت میں نچھاور کردوں تاکہ میرا شمار ان لوگوں میں ہوجائے کہ جو کھاتے دنیا کی ہیں اور کام دین کے لئے کرتے ہیں، ان لوگوں میں نہیں کہ جو کھاتے دین کی ہیں اور کام دنیا کے لئے کرتے ہیں۔

خدایا : تیرا شکر کرتے میری زبان نہیں تھکتی کہ جس قدر میں تیری راہ میں، تیرے پیام کی راہ میں زیادہ آگے بڑھتا ہوں، زیادہ مشقت جھیلتا ہوں، ان لوگوں کو جنہیں چاہئے کہ میری ہمت افزائی کریں مجھ پر ضرب لگاتے ہیں۔ جنہیں چاہئے کہ میرا ساتھ دیں میری راہ میں کانٹے بکھیرتے ہیں، جنہیں چاہئے کہ حق شناسی کریں، حق تلفی کرتے ہیں، جنہیں

چاہئے کہ شفقت سے ہاتھ ملائیں، سیلی مارتے ہیں، جنہیں چاہئے کہ دشمن کی نسبت میرا دفاع کریں، دشمن سے پہلے حملہ کرتے ہیں، جنہیں چاہئے کہ غیروں کی زہر افشانی کے مقابل میری ستائش کریں، مجھے تقویت پہنچائیں، میری ہمت بندھائیں، مجھے تسلی دیں۔ مجھے ملامت کرتے ہیں، کمزور بناتے ہیں، ناامید کرتے ہیں اور مجھ پر الزام لگاتے ہیں، تاکہ میں ---تیری راہ میں--- اس واحد سہارے سے جس سے میں نے آس باندھ رکھی ہے ناامید ہوجاؤں، اپنی آنکھیں بند کرلوں اور راندہ درگاہ ہوجاؤں...... خدایا میری مدد فرما، تاکہ میری واحد امید تو رہے، صرف تجھ سے اپنی توقعات وابستہ رکھوں، صرف تجھ سے مدد کا طالب رہوں، صرف تجھ سے صلے کا خواہاں رہوں، اور اس معاملے میں جو میرے اور تیرے درمیان ہے کوئی دوسرا شریک نہ ہو، تاکہ تیرے ساتھ میری ذمہ داری واضح ہوجائے، تاکہ میرے ساتھ میری ذمہ داری معلوم ہوجائے، تاکہ "اخلاص" کی اس حلاوت کو چکھوں کہ جس دل نے بھی ذرہ برابر اسے چکھا ہر شیرینی اس کے کام ذہن میں تلخ ہوگئی۔ خدایا، اخلاص! اخلاص!

اور میں جانتا ہوں' اے میرے پروردگار مجھے معلوم ہے کہ عشق کے لئے جینا اور بھلائی اور نیکی کے لئے مطلق ہونا کس طرح انسان کو "مطلق" کی طرف لے جاتا ہے۔ کس طرح اخلاص' اس نسبی وجود کو' اس موجودِ حقیر کو جو توقعات' احتیاجات اور کمزوریوں کا مجموعہ ہے' "مطلق" کرتا ہے۔

ان تمام حقیر رغبتوں' بلاؤں' خساروں' اندیشوں' ہولناکیوں' وسوسوں' وسیلوں' قربتوں' امیدوں' بھروسوں' کامیابیوں' ناکامیوں' خوشیوں اور دکھوں کے مقابل کے جنہوں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے اور ہمہ دم خوفزدہ کر رکھا ہے اور جو ہماری یکسانیت بھری زندگی کی مردہ لاش کے چاروں طرف بھیڑیوں' لومڑیوں' گدھوں' اور کیڑے مکوڑوں کی طرح چمٹے ہوئے ہیں' ہمیں مطلق کرتا ہے (یہ اخلاص) ایک "عظیم انقلابی خود خواہی کے ساتھ

---کہ جو "ذکر" کا معجزہ اور "انسان کی اپنی عاجزانہ بندگی" کے انکشاف کی پیداوار ہے---

اچانک برگشتگی لاتا ہے۔

---ایسی برگشتگی کہ جو تسلیم مطلق کے انتخاب کے ساتھ حقیقت مطلق تک جا پہنچتا ہے اور فطرت کی گہرائی سے شعلہ ور

ہوتا ہے---

اور پھر بے نیازی ' بے تعلقی ' اور تنہائی بدھا صفت تیغ کے

ساتھ "مجرد" ہو جاتا ہے اور اس کے بعد '

بدھا سے آگے نکل جاتا ہے اور "فقر" و "بے نیازی"

کے دو تازیانوں کے ساتھ اپنی یکسانیت بھری زندگی کے

اطراف چمٹے ہوئے آدم خور جانوروں کو بھگاتا ہے۔

اور پھر '

آزاد ' سبکبار --- غسل کیا ہوا ' طاہر --- پاک و پارسا '

"تنہا" ' "مجرد" ' "رستگار" اور انسان و بے نیاز ہو کر

معراج تنہائی کی بلند ترین چوٹی پر پہنچتا ہے اور وہاں ساری

جھوٹی اور بدنما "خودی" کو

--- کہ جو اس شہید ' سچی ' خوبصورت ' اور اچھی "خودی" پر

بنی ہوئی قبر ہے جس میں وہ ہمیشہ دفن ہے اور جو خود اپنی آنکھ

سے بھی اوجھل اور اپنی یاد سے بھی فراموش ہے---

گرا دیتا ہے '

"ذکر" کے ساتھ ' "جہاد اکبر" کے ساتھ اور "موت سے

پہلے مرجانے" کے ساتھ اپنے باطن سے ہجرت کا آغاز کرتا

ہے اور "جہاں ہے" سے "جہاں ہونا چاہئے" کی طرف

ہجرت کرتا ہے۔

یہاں تک کہ.......

اخلاص تک پہنچتا ہے' خلوص کے ساتھ' "باقی رہنے" تک پہنچتا ہے'

اس کے سامنے اس کے لئے خالص ہو جاتا ہے۔

اور ہزاروں سال پہلے'

ایک قرآن فہم اور لفظ شناس فارسی مفسر نے کتنی بلندی سے مفہوم کو لیا ہے :

اخلاص : "یکتائی" (۱)

جی ہاں : یکجائی!

اور پھر اس طرح کا "خاضع و خاشع بندہ"

کہ جو بندگی میں' خدا صفت ہو گیا ہے' اور پھر ایسی "خاکی دوستی"

---کہ جو چاہنے میں قرب خدا تک پہنچ گئی ہے' اس لئے کہ

۱۔ مشہد کے آستان قدس کے خطی قرآن کا وہ نسخہ کہ جو چوتھی صدی میں لکھا گیا اور احتمالاً" طبری کے دور کا قرآن ہے۔

یہ چاہنا اور یہ محبت و رغبت اگر اخلاص کی چوٹی تک پہنچ جائے تو دوست کو دوست کی طرح کردیتی ہے--- زندگی سے زندہ تر اور خوش نصیبی سے بالاتر کردیتی ہے' اور پھر وہ نیاز' ہراس' توقعات' حق شناسی' حق تلفی' خوف و خطر' چین و سکون' سودزیاں' عداوتیں' رفاقتیں' ہارجیت' خوشحالیاں اور بدحالیاں.....

---کہ جو آدم خوراور وحشی گدھ اور بھیڑیئے تھے---
اب کیڑے مکوڑے بن گئے ہیں' انسان کے لئے ناقابل اعتناء!

اور انسان' "اپنے اندر ایک جزیرہ"
وجود کے سمندر میں'
تنہا' "اپنے آپ میں گم"
چہار سو اپنے اقلیم میں محدود
موج سے بے خطر' ساحل سے بے نیاز
کیچڑ سے ابھرا ہوا اور پانی سے سر نکالا ہوا کنول' لیکن آلائش سے پاک شگفتہ' کھلا ہوا' سورج کی نورانی بارش کے نیچے' جاذب آفتاب! اور اب وہی ہے کہ جو جی سکتا ہے'
صرف "عقیدہ" کی بھوجن اور "جہاد" کی شراب کے ساتھ

اور مر سکتا ہے 'مانند شہید'
اسی زیبائی' اسی درستی' اور اسی آزادگی کے ساتھ جس میں وہ زندگی بسر کرتا ہے۔

اور---

---چونکہ وہ "صوفی" نہیں' "شیعہ" ہے' "بدھسٹ" نہیں "مسلمان" ہے--- لہٰذا وہ اسی معراج تجرد میں پڑا نہیں رہتا' لوٹ آتا ہے' خاک کی طرف' خلق کی طرف' ذمہ داری کا بوجھ کاندھوں پر لئے :
"امانت" کا سنگین بار دوش پر اٹھائے'
تاکہ اس یتیم چہرے پر شفقت کی نظر ڈالے جسے سختی سے دھتکارا گیا ہے۔ اس اسیر قیدی کی پشت کا مشاہدہ کرکے جس پر تازیانوں نے سیاہ خطوں میں اپنا نقشِ ستم ثبت کیا ہے۔
اس مہر بہ لب بھوکے کو دیکھے جس کو شرم' حاجت مند کی صورت اختیار کرنے کی جرات نہیں دیتی۔
اور اسی طرح انسانوں کے اس طبقے کو دیکھے جس نے ظلم کو گلے لگالیا ہے' اس قوم کو دیکھنے جو نجات کی طلب گار ہے' اس نسل پر نگاہ کرے جو دوسروں کی بھینٹ چڑھ رہی ہے' اس عصر کو دیکھے جو سورماؤں کی متلاشی ہے' اور ہر اس چیز پر

توجہ دے جو تہ آسمان عمل میں آرہی ہے..... وہ "نقصان جھیلنے"، "دکھ سہنے"، "کچھ حاصل کرنے"، اور مرنے کے لئے متردد نہیں ہے!

موت---

حلاج والی نہیں : کہ جو بے کھوٹ تو ہو مگر بے مقصد بھی ہو۔

علیؑ والی موت :

خدا کی خوشنودی کے لئے : یعنی خدمت خلق کی راہ میں

اور یہی وہ تنہا کام ہے کہ جس سے وہ زندگی میں خود بھی مستفید ہوتے ہیں! اور یہی وجہ ہے کہ حسینؑ اس سرخ دن کے اختتام پر، اپنے تمام ہمراہیوں کے موج خون میں، آراستہ و پیراستہ ہوتے ہیں، خوبصورت لباس پہنتے ہیں، خوشبو لگاتے ہیں---جس قدر ان پر نسیم شہادت کے جھونکے تیز تر ہوتے ہیں اور جس قدر وہ اپنے خون کی بو کو زیادہ واضح طور استشمام کرتے ہیں--- انکے شوق میں اضافہ ہوتا ہے، ان کے چہرے کی رونق بڑھ جاتی ہے یہاں تک کہ نابینا دشمن بھی اس کو دیکھ لیتا ہے اور حیرانی سے طعنہ میں کہتا ہے :

اے ابو طالب کے بیٹے دولہا بن کر آئے ہو؟!

وہ فاتحانہ شان کے ساتھ بڑی سرفرازی اور سرشاری سے جواب دیتے ہیں :

ہاں' بے شک! سرخ احمری حجلہ' سج گیا ہے اور اب شہادت کی خوبصورت دلہن--- کہ جس نے موت کے ساتھ بندھن باندھ لی ہے--- ابھی آنے کو ہے! اور علیؑ!

جب زہر آلود فولاد کی دھار کو اپنے مغز سر کے پردوں پر محسوس کرتے ہیں تو انہیں ایسا لگتا ہے کہ جیسے وہ بھاری بوجھ اور وہ امانت کہ جو آسمان' زمین اور پہاڑوں کے لئے ناقابل تحمل تھا ان کے کاندھوں سے گر پڑا اور وہ آزاد ہو گئے' اور اسی منزل پر بڑے اشتیاق کے ساتھ اس طرح بلند آواز میں پکارتے ہیں گویا کوئی نوید سنا رہے ہوں :

"فزت بہ رب الکعبہ"

کعبہ کے رب کی قسم میں آزاد ہو گیا

اخلاص :

"جینے" میں یکتائی

"باقی رہنے" میں یکتائی

"عشق" میں یکجائی

"شہادت" کانفرنس کے
اختتام کی دعا کا متن:

اے میرے خدا!

اے وہ کہ جس نے "بنی آدم کو کرامت بخشی"
اے وہ کہ جس نے "اپنی خاص امانت کو بنی آدم کے کاندھوں پر رکھا"
اے وہ کہ جس نے اپنے تمام انبیاء کو کتاب کی تعلیم اور عدالت کی برقراری کے لئے مبعوث کیا۔
اے وہ کہ جس نے "عزت کو اپنے لئے' اپنے انبیاء کے لئے اور صاحبان ایمان کے لئے جانا ہے....."
ہم انسان ہیں'
تجھ پر اور تیرے پیغمبروں پر ہمارا ایمان ہے۔
ہم آزادی' بیداری' عدالت اور عزت کو تجھ سے مانگتے ہیں'
ہمیں معاف کر اس لئے کہ ہم سخت محتاج ہیں اور ہر زمانے سے زیادہ دردناک صورت سے جہل و اسارت و ذلت میں گرفتار ہیں۔

اے مظلوموں کے خدا!

اے وہ کہ جس نے اس بات کا ارادہ کیا ہے کہ زمین پر بسنے

والے مظلوم لوگوں پر احسان کرے اور ان حیات سے محروم بنائے جانے والے کمزور محکوموں کو ---کہ جو تاریخ سازوں کی زیادتیوں کے اسیر، ظلم اور زمانے کی غارت گری کے قتیل اور زمینی دوزخ کے کینہ ور حاسدوں کا شکار ہیں--- انسانوں کی رہبری پر مامور کرے اور انہیں ان کی دنیا کی وراثت عطا کرے"!

اب اس کا وقت آگیا ہے اور زمین پر کمزور بنائے جانے والے لوگوں کو تیرے وعدہ کا انتظار ہے۔

اے مظہر غیرت! اس زمانے میں صرف زمین کے مظلوم و مستضعف لوگ ہی تیرے پرستا ہیں!

اے میرے خدا!

اے وہ کہ جس نے "سارے فرشتوں کو آدم کے قدموں پر سجدہ ریز کیا""

کیا نہیں دیکھ رہا ہے کہ بنی نوع انسان کو شیاطین کے قدموں پر سجدہ ریز کیا جا رہا ہے؟ ان سب لوگوں کو اس صدی کے ان بتوں سے ---کہ جنہیں ہم نے خود تراشا ہے---

اپنی حریت آفریں بندگی میں آزادی عنایت فرمایا!

اے میرے رب!

یہ لوگ جو تیری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں' تیرے پیامبروں کو ناحق قتل کرتے ہیں' اور ان لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارتے ہیں کہ جو لوگوں ہی میں سے ہدایت کے لئے اٹھے ہیں اور بنی نوع انسان کو عدالت و مساوات کی دعوت دیتے ہیں۔" اب بھی فرش زمین پر مسلط ہیں۔
ان پر اس عذاب کو مسلط کر جس کی تو نے خوشخبری دی تھی!

اے میرے رب!

ہمارے علماء کو ذمہ داری کا احساس' ہماری عوام کو علم' ہمارے مومنوں کو روشنی' ہمارے روشن خیال لوگوں کو ایمان' ہمارے متعصب لوگوں کو جنبش' ہمارے صاحبان فہم کو تعصب' ہماری عورتوں کو شعور' ہمارے مردوں کو بزرگی' ہمارے بوڑھوں کو بیداری' ہمارے جوانوں کو پختگی' ہمارے

اساتذہ کو ایمان' ہمارے طلبہ کو.... نیز ایمان' ہمارے خفتگان کی بیداری' ہمارے بیداروں کو ارادہ' ہمارے مبلّغوں کو حقیقت بیانی' ہمارے دینداروں کو دین' ہمارے اہل قلم کو فرض شناسی' ہمارے اہل فن کو درد' ہمارے شاعروں کو شعور' ہمارے محققوں کو مقصدیت' ہمارے ناامیدوں کو امید' ہمارے کمزوروں کو طاقت' ہمارے محافظین کو دلیری' ہمارے نشستگان کو قیام' ہمارے ست اور بے دم بیٹھے لوگوں کو حرکت' ہمارے مرنے والوں کو حیات' ہمارے نابیناؤں کو بینائی' ہمارے چپ لوگوں کو فریاد' ہمارے اہل اسلام کو قرآن' ہمارے شیعوں کو علیؑ' ہمارے فرقوں کو اتحاد' ہمارے حاسدوں کو شفا' ہمارے خودغرض لوگوں کو انصاف' ہمارے بدزبان لوگوں کو ادب' ہمارے مجاہدوں کو صبر' ہمارے لوگوں کو خود آگاہی اور ہماری پوری قوم کو عزم و استعداد و جانثاری اور نجات و عزت کی شائستگی عنایت فرما۔

اے کعبہ کے خدا!

یہ سب لوگ کہ جو ساری عمر' ہر صبح و شام' اس دنیا میں

تیرے گھر کا رخ کئے ہوئے ہیں' تیرے گھر کے رخ پر چل رہے ہیں اور تیرے گھر کے رخ پر موت سے ہمکنار ہو رہے ہیں' ان سب لوگوں کو کہ جو تیرے ابراہیم کے گھر کا طواف کر رہے ہیں' جہلِ شرک کی بھینٹ چڑھتے اور جورِ نمرود کا شکار ہوتے نہ دیکھ۔

اور آپ اے محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم)

اے بیداری' آزادی اور قوت و قدرت کے پیغامبر
ایک خانماں سوز آگ آپ کے گھر میں بھڑک اٹھی ہے'
ایک تباہ کن سیلاب نے مغرب سے آپ کی سرزمین کا رخ کیا ہے اور آپ کا گھرانہ بڑی دیر سے ذلت کے سیاہ بستر پر پڑا سو رہا ہے۔
ان کے سرہانے بلند آواز میں چلا کر کہئے!
قم فانذر
انہیں بیدار کیجئے۔

اور آپ اے علیؑ

اے شیر یزداں

مرد خدا و بشر

خدائے عشق و شمشیر

ہم نے "آپ کی شناخت" کی شائستگی کھودی ہے' آپ کی شناخت کو ہمارے ذہنوں سے دھودیا گیا ہے لیکن حالات زمانہ کے باوجود ہم نے "تیرے عشق" کو اپنے ضمیر کی گہرائی میں اپنے دل کے پس پردہ ہمیشہ کی طرح زندہ اور مضطرب رکھا ہے۔

بھلا کس طرح آپ اپنے چاہنے والوں کو ذلت و خواری میں پڑا رہنے دیں گے؟

آپ نے ایک یہودی عورت پر ظلم کو ---جو آپ کی حکومت کی ذمہ داری پر جی رہی تھی--- برداشت نہیں کیا' مگر اب آپ مسلمانوں کو یہودیوں کی کفالت میں دیکھئے۔

اور دیکھئے کہ ان پر کیا گزر رہی ہے۔

اے وہ صاحب بازو ---کہ جس کی ایک ضرب ثقلین کی عبادت سے بھاری ہے---

ایک ضرب اور!

اور آپ دونوں عظیم المرتبت حضرات :

اے بہن! اے بھائی!

اے وہ کہ جنھوں نے "انسانیت" کو مفہوم دیا، جنھوں نے آزادی کو حیات دی، ایمان و امید کو ایمان و امید دیا اور اپنی پر شکوہ موت سے حیات کو زندگی بخشی!

ہاں۔ اے دو ذی وقار ہستیو!

اس دردناک دن سے --- کہ جس کے تصور سے خیال پر لرزہ طاری ہوتا ہے اور دل اس کے غم سے پارہ پارہ ہوجاتا ہے --- آج تک اس قوم کی آنکھیں خشک نہیں ہوئی ہیں۔

ہمارے لوگ صدیوں سے آپ کے غم اور آپ کی محبت میں گریہ کررہے ہیں۔

کیا یہ بات نہیں کہ عشق اور محبت کی زبان آنسو ہے؟

ایک قوم تاریخ کے طویل دھارے پر آپ کے غم میں گریہ و شیون کررہی ہے اس جرم میں اس نے جانے کتنے تازیانے کھائے، کتنی قتل عام سے گزری، کتنے شکنجوں کے

عذاب سے اور ہرگز ایک لمحہ کے لئے بھی آپ کی یاد اس کے دل سے نہ مٹی، آپ کے بے تاب عشق کا الاؤ اس کے دل میں سرد نہیں ہوا۔

وہ ہر تازیانہ جو کسی بدخو اور بدنہاد جلاد سے اس کی پشت پر لگا آپ کی مہر کا داغ اپنے پیچھے چھوڑ گیا ہے.....

اے کربلا کی شیر دل خاتون زینب

اے علیؑ کے لہجے میں بولنے والی!
اپنی قوم سے کچھ کہئے!
اے شہزادی!
---اے وہ کہ جس کے رکاب میں مردانگی نے جوانمردی سیکھی---
ہماری قوم کی عورتوں کو---ان کو کہ جن کے وجود میں آپ کا نام ان کے درد و عشق کی آگ کو بھڑکاتا ہے--- آپ کی ضرورت ہے۔
ہمیشہ سے زیادہ!
ایک طرف سے "جہل" نے انہیں اسارت و ذلت کا

شکار بنا رکھا ہے اور دوسری طرف سے مغرب انہیں درپردہ اسارت اور نئی ذلت کی طرف کھینچ رہا ہے اور اس طرح آپ سے اور اپنے آپ سے بیگانہ بنا رہا ہے۔

جس طرح کہ آپ نے "جدید و قدیم **استحمار** (۱) " پر

دقیانوسی مراسم کی بندگی اور گندی دعوتوں پر' اور "قدیم تعصب اور جدید تفنن" کے بازیچہ سازوں پر

آہ و نالوں کی اس طاقت کے ساتھ جن سے آپ نے ایک

ایسی بستی پر

---ایک قساوت و وحشت بھرے شہر پر---

ضرب لگائی!

اور ایک قصر کی بنیادوں کو

---قصر شقاوت و طاقت--- کو

ہلایا

اسی طرح ان کو بھی زیر و زبر کیجئے

۱- استحصال کی وہ قسم جو ایک فریب کار لومڑی کی طرز پر ہو یا آسان لفظوں میں "سرمایہ دارانہ حاکم قوت" (اردو ترجمہ)

تاکہ ان کے اندر ہی کے لوگ ان کے خلاف اٹھ کھڑے
ہوں
اور فریب کی مکڑی کے ان جالوں کے تانے بانوں کو چاک
کر دیں
تاکہ وہ ---اس بربادی مچانے والے طوفان کے آگے کہ جو
چل نکلا ہے---
"پیر جمانا" سیکھیں،
اور ان ہولناک مشینوں کو---
کہ جن سے وہ ایک بار پھر نئے استعمار، نئے فریب، اور
ایام فراغت کی مشغولیت کے لئے یر بازار میں سرمایہ داری
کی لائی ہوئی جنس کو نگلنے، گندی بورژوازی (سرمایہ دار طبقے
سے متعلق) خواہشوں کو لذت بخشنے، مردہ اور بے روح
"جدید اشرافیت" کی خلوتوں اور ایوانوں میں ولولہ آفرینی
اور "ایک فلاحی معاشرہ" کی بے ہودہ، بے مقصد اور بے
جان زندگی کی مشغولیت کے لئے "نئے کھلونے" بنا رہے ہیں،
توڑ دیں
---اور آپ کی پیشوائی میں---
اپنے آپ کو "قدیم اسارت کے حریم" اور "جدید

بے حرمت بازاروں سے نجات دیں!

اے علیؑ کی زبان سے بولنے والی

اے حسینؑ کے پیغام کا بوجھ سہارنے والی!

اے کربلا میں بھرا گھرا جاڑ کر واپس لوٹنے والی!

اے شہیدوں کے پیغام کو جلادوں اور سفاکوں کے مستقل شور میں تا ایں دم گوش تاریخ تک پہنچانے والی'

زینبؑ!

ہم سے کلام فرمایئے

یہ نہ کہئے کہ آپ پر کیا گزری'

آپ نے اس سرخ صحرا میں کیا دیکھا'

وہاں سرزد ہونے والے جرم کی حدیں کہاں تک پہنچیں

نہ کہئے کہ خدا نے اس دن اپنے عزیز ترین اور پر شکوہ ترین قدروں اور عظمتوں کی' جنہیں اس نے خلق فرمایا تھا یکجا فرات کے ساحل اور صحرائے طف کے تپتے ریگزاروں پر کس طرح جلوہ نمائی کی' اور انہیں فرشتوں کے آگے پیش کیا

تاکہ وہ یہ بات جان لیں کہ آدم کو سجدہ کرنا کیوں ضروری تھا.....؟

ہاں، اے زینب!

یہ نہ بتایئے کہ وہاں آپ پر کیا گزری،

دشمنوں اور دوستوں نے آپ کے ساتھ کیا کیا.....؟

ہاں اے "انقلاب حسینی کے پیامبر"

ہمیں یہ سب باتیں معلوم ہیں

ہم نے یہ سب باتیں سنی ہیں،

آپ نے کربلا کے پیغام اور شہیدوں کی باتوں کو بڑی سچائی سے ہم تک پہنچایا ہے۔

آپ وہ شہید ہیں کہ جس نے اپنے خون سے کلمہ کو مرتسم کیا۔

---بالکل اپنے بھائی کی طرح جس کے پاک خون کا ہر قطرہ زبان حال سے بولتا تھا---

لیکن بتایئے،

اے بہن،

بتایئے کہ ہم کیا کریں؟

ایک لحہ کے لئے نظر اٹھا کر دیکھئے کہ ہم پر کیا بیت رہی ہے۔

پل بھر ہمیں سنیئے تا کہ ہم اپنے مصائب آپ سے عرض

کریں،

اے ہماری مہربان بہن

یہ آپ ہی ہیں جو ہم پر گریہ کرسکتی ہیں،

اے اپنے بھائی کے پیغام کی امین،

کہ جو کربلا سے لوٹنے کے عمل میں، تاریخ کے گزرتے دھارے پر شہیدوں کے پیغام کو ہر نسل تک پہنچا رہی ہو۔

اے وہ کہ جو شہادت کے احمری بوستانوں سے، اس دیار کی خوشبو دامن میں سمیٹے لوٹ رہی ہو،

اے علیؑ کی بیٹی

اے بہن

اے اسیروں کے کاررواں کی قافلہ سالار

ہمیں بھی اس قافلے کے پیچھے اپنے ساتھ لے جایئے!

ولیکن آپ اے حسینؑ

آپ سے کیا عرض مدعا کروں؟ ؎

"شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابی چنیں حائل"

(اندھیری رات' خوف موج اور ایک ہولناک گرداب کا سامنا ہے)

اور آپ' اے چراغ راہ

اے کشتی نجات'

اے وہ لہو کہ جو اس نقطہ صحرا سے مسلسل پھوٹ رہا ہے اور ابل ابل کر زمانے کے بستر پر پھیلتا جا رہا ہے اور ہر نسل سے ہوتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے' ہر زرخیز زمین کو سیراب کر رہا ہے۔ ہر معقول بیج کو زمین کی تہہ میں شگافتہ کر رہا ہے' اسے شگوفہ کی صورت دے رہا ہے اور ہر تازہ پودے کو زندگی کے برگ و بار سے آراستہ کر کے اسے خوشحالی تک پہنچا رہا ہے'

اے شہادت کے عظیم معلم!

اس نور کے ایک پرتو کو ہماری سیاہ اور امید سے خالی شبستان میں بھی منعکس فرمایئے۔ اپنے سے وابستہ ایک حیات بخش قطرے کو ہمارے خشک اور نیم مردہ بستر پر بھی جاری فرمایئے۔

اور اس آگ اگلنے والے صحرا سے گرمی کی ایک لہر کو ہمارے اس سرد اور اکڑا دینے والے جاڑے پر نازل کیجئے۔

اے وہ کہ جس نے اپنے لئے "سرخ موت" کو اس لئے چنا

کہ اپنے دیوانوں کو "سیاہ موت" سے چھٹکارا دلائے۔
تاکہ اپنے خون کے ہر قطرے سے ایک قوم کو زندگی بخشے، تاریخ کو طپش میں لائے، زمانے کے مردہ اور بے جان ڈھانچے میں گرمی حیات پیدا کرے اور اسے جوش و خروشِ زندگی اور عشق و امید کی دولت عطا کرے۔

ہماری ملت،

ہمارا ایمان،

ہمارے کل کی تاریخ،

اور

ہمارے زمانے کی جسم و جاں
آپ کی اور آپ کے مقدس خون کی محتاج ہے۔

☆